جنوری ۱۹۹۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

• فکرِ اقبال کی تعمیل کا تاریخی جائزہ
امیر تنظیم اسلامی کا سلسلہ مضامین

• دین میں سمع وطاعت کا مقام
درسِ قرآن ——— ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی

ایک پرسوز نظم 'ایک دعا' ——— از علامہ شبیر بخاری

ماں

مرجعِ تخلیق ماں' گہوارۂ تعمیر ماں
کائناتِ زندگی کی اوّلیں تعبیر ماں
عظمتِ ہفت آسماں سجدہ کناں تیرے حضور
مصحفِ انسانیت کی آیۂ تطہیر ماں!!
ہر نفس تیرا پیامِ عزم و ہمت تھا مجھے
پیکرِ صبر و رضا' ایثار کی تصویر ماں!
تیری آغوشِ محبت' مکتبِ علم و یقیں
علم کی قندیل ماں' عرفان کی تنویر ماں!!

ذکر ہے وردِ زباں ہر دم بچشمِ نم ترا
ہے متاعِ بے بہائے ہر دو عالم غم ترا

رحمتِ باری ترے مرقد پہ ہو سایہ فگن
مہرومہ قرباں کرے صبح و مسا چرخِ کہن
پھول برسائیں بہاریں گلستاں در گلستاں
نور برسائیں ستارے انجمن در انجمن
تا ابد ٹھنڈی رہے اے ماں تری خاکِ لحد
حشر تک خوشبوؤں تیرا معطر ہو کفن
قبر کی تاریک راتوں میں اجالا ہو مدام
عاقبت محمود ہو تیری بحقِ ذوالمنن

اے وِلا تیری چراغِ آگہی تجھ پر سلام
اے دُعا تیری سراغِ زندگی تجھ پر سلام

(یہ نظم محترم علامہ صاحب نے امیر تنظیم اسلامی کی والدہ کی وفات پر اپنے تعزیتی خط کے ساتھ ارسال فرمائی)

28/16/36

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۲
شمارہ: ۱
رجب المرجب ۱۴۱۳ھ
جنوری ۱۹۹۳ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرتعاون ۵۰/-

سہ ماہی میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

ادارہ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، مسقط، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات - ۲۵ سعودی ریال
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا - ۶ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ - ۹ امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ - ۱۲ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

یکے از مطبوعات تنظیم اسلامی، مرکزی دفتر: ۶۷- اے، علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور

پبلشر: لطف الرحمٰن خان، طابع: رشید احمد چوہدری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

☆ عرض احوال — ۳
حافظ عاکف سعید
☆ الہدیٰ (قسط ۸۲) — ۵
اعرض عن الجہاد کی پاداش: نفاق' سورۃ المنافقون کی روشنی میں (۵)
ڈاکٹر اسرار احمد
☆ بسلسلہ منہج انقلاب نبویؐ — ۱۱
فکر اقبال کی تعمیل کا تاریخی جائزہ
ڈاکٹر اسرار احمد
☆ درس قرآن — ۳۴
دین میں "سمع و طاعت" کا مقام
امیر تنظیم اسلامی کے درس قرآن سے ماخوذ
خالد محمود خضر
☆ کتابیات — ۴۷
گیارہواں کبیرہ: بیت اللہ کی حرمت پامال کرنا
ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور
☆ ولذکر اللہ اکبر — ۵۲
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ
☆ انفاق کا معیار مطلوب — ۵۷
الفاظ قرآنی "قل العفو" کی روشنی میں
ڈاکٹر محمد عثمان
☆ افکار و آراء — ۶۲
شمیم احمد صدیقی کا مکتوب جناب جاوید احمد غامدی کے نام
☆ دعوت و تحریک — ۷۱
الاخوان المسلمون
قاضی ظفر الحق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

بابری مسجد کی شہادت کے سانحے کو قریباً ایک ماہ بیت چکا ہے۔ مسلمانانِ پاکستان پر اس واقعے کا ردِ عمل بڑا شدید ہوا۔ ہر خاص و عام یہ اندوہناک خبر سن کر ایک بار چونک سا گیا کہ کیا بھارت میں مسلمانوں کی عبادت گاہیں قطعی غیر محفوظ ہو چکی ہیں' کیا بھارت کا مسلمان اتنا لاچار ہو چکا ہے کہ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک تاریخی مسجد چند گھنٹوں کے اندر اندر مسمار کر دی گئی اور وہ بے بسی اور لاچاری کی تصویر بنا رہا' اور یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا' علی الاعلان اور بہانگِ دہل ہوا ـــــ اور کیا ہم مسلمانانِ پاکستان اس درجے بے حس اور ہماری حکومت بھارت کے مقابلے میں اتنی غیر مؤثر ہو چکی ہے کہ ایک اتنا بڑا واقعہ جو وقوع پذیر ہونے سے ہفتوں قبل ہی نوشتۂ دیوار بنا ہوا تھا' اس کی روک تھام کے لئے کوئی ٹھوس پیش بندی تو کیا کرتے' حکومتی سطح پر اس متوقع سانحے پر ہم بھارتی حکومت سے کوئی اظہارِ تشویش بھی نہ کر سکے!! ـــــ یہ سانحہ مسلمانانِ پاکستان کے لئے ان خدائی تنبیہات میں سے ایک تھا جو گاہے بگاہے ہمیں جھنجوڑنے اور ہوش میں لانے کے لئے فاطرِ فطرت کی جانب سے ہم پر وارد کی جاتی ہیں' چنانچہ اس سانحے کی خبر سن کر ہر شخص ایک بار تو بھونچکا سا رہ گیا کہ یہ سب کیا ہوا اور کیسے ہوا' لیکن اس خدائی تنبیہہ سے کوئی مثبت فائدہ اٹھانے اور آمادۂ اصلاح ہونے کی بجائے پوری قوم نے ہوش و شعور سے بیگانگی کا جو مظاہرہ کیا وہ انتہائی قابلِ رنج ہے۔ ہم نے بحیثیتِ قوم اندھے جذبات سے مغلوب ہو کر ملک گیر سطح پر اور بالخصوص پنجاب میں ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو مسمار کر کے اپنے دل کو ٹھنڈا کرنے کا جو جھوٹا سامان فراہم کیا وہ بھی یقیناً قابلِ مذمت اور لائقِ ملامت ہے لیکن زیادہ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ ہمارا فوری ابال اور اشتعال حسبِ سابق محض ایک "شعلۂ مستعجل" ثابت ہوا اور ایک بلبلے کی مانند بیٹھ گیا اور یہ واقعہ نہ تو ہمارے روز و شب کے معمولات میں کسی مثبت تبدیلی کا ذریعہ بنا' نہ ہماری سوچ اور رویّے پر اس سے کوئی دیرپا اثرات مترتّب ہوئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نہ ہی اس سے کوئی سبق سیکھ کر ہم نے آئندہ ہندوؤں کی اس جنونی یلغار کے مقابلے

کے لئے کوئی لائحہ عمل مرتب کیا! ہمارا قومی ضمیر شاید اس درجے بے حس بلکہ مردہ ہوچکا ہے کہ اس نوع کی تنبیہات سے ہم کوئی اثر لینے کو تیار نہیں!---

یہی طرزِ عمل یہود نے اختیار کیا تھا جو ان کی تباہی اور شدید ذلت و رسوائی کا موجب بنا تھا۔ قرآن حکیم نے ہمیں واشگاف الفاظ میں متنبہ کردیا تھا کہ "وَلَا یَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ" (سورۃ الحدید، آیت ۱۶) کہ دیکھنا اُن لوگوں کی مانند نہ ہوجانا جنہیں اس سے قبل کتاب دی گئی، یعنی یہود--- انہوں نے اللہ کی نازل کردہ تنبیہات سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا---تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دل سخت ہوتے چلے گئے --- ایک زندہ قوم میں اس قسم کے چونکا دینے والے واقعات جو مثبت تبدیلی اور کچھ کر گزرنے کا عزم پیدا کرتے ہیں اس کا کوئی سراغ ہمیں اپنی ملی زندگی میں دُور دُور تک نظر نہیں آتا اور یہی بات زیادہ قابلِ رنج اور باعثِ افسوس ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

☆ ☆ ☆

حسبِ اعلان ماہ دسمبر کے اواخر میں تنظیم اسلامی کے عہدیداروں اور ذمہ دار رفقاء کے لئے ایک بھرپور تربیت گاہ کراچی میں منعقد ہوئی۔ اس تربیت گاہ کے لئے جسے ریفریشر کورس کہنا زیادہ مناسب ہوگا، ملک کے طول و عرض سے رفقاءِ تنظیم اسلامی جن میں مقامی امراء، نقباء اور دیگر عہدیداران شامل تھے، جمعہ ۲۵ر دسمبر کی شب کراچی پہنچ گئے تھے۔ ہفتہ، ۲۶ر دسمبر کا پورا دن توسیعی مشاورت کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ یہ توسیعی مشاورت کُل پاکستان بنیاد پر نہیں تھی بلکہ مقامی طور پر حلقہ سندھ اور بلوچستان تک محدود تھی۔ مشاورت کا یہ پروگرام اس اعتبار سے بہت کامیاب رہا کہ کراچی کے مقامی رفقاء کی ایک اچھی خاصی قابلِ ذکر تعداد نے اس میں شرکت کی اور اپنے اپنے انداز میں کھل کر اظہارِ خیال کیا۔ توسیعی مشاورت کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تنظیم اسلامی کے ہر رفیق کو، خواہ وہ مشاورت سے ایک روز قبل ہی تنظیم میں شامل ہوا ہو، تنظیم کی پالیسی پر ہی نہیں امیرِ تنظیم اسلامی کی ذات اور ان کی نجی زندگی کے بارے میں گفتگو اور تنقید کی بھی کھلی آزادی ہوتی ہے۔ امیر تنظیم اس پروگرام میں بطورِ سامع شریک ہوتے

(باقی صفحہ ۸۰ پر)

مباحث جہاد فی سبیل اللہ
درس ۵

الہدیٰ قسط: ۸۲

اعراض عن الجہاد کی پاداش

نفاق

سورۃ المنافقون کی روشنی میں (۵)

(گزشتہ سے پیوستہ)

اگلی دو آیات میں عبداللہ بن اُبی کا وہ قول نقل کیا گیا جس سے اس کا خبثِ باطن جھلکتا تھا۔ اس طرح گویا تصدیق ہو گئی حضرت زید ابن ارقمؓ کی کہ انہوں نے عبداللہ بن ابی پر جو الزام لگایا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ فرمایا: "هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا" کہ یہی وہ لوگ ہیں کہ جو کہتے ہیں مت خرچ کرو ان لوگوں پر جو اللہ کے رسول کے ساتھ ہیں' یہاں تک کہ یہ سب منتشر ہو جائیں!—— یہ لوگ تمہارے چندوں اور تمہارے صدقات پر پل رہے ہیں۔ یہ ساری ہمہ ہمی اور ساری شورا شوری درحقیقت تمہارے اس ایثار اور انفاق کی بنیاد پر ہے۔ تم اگر ہاتھ روک لو تو یہ سب چلتے پھرتے نظر آئیں گے' یہ بھیڑ چھٹ جائے گی۔ جواباً فرمایا: "وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں۔ یعنی یہ ان کی نری خام خیالی ہے کہ مہاجرین کو رزق وہ فراہم کرتے ہیں' لیکن ان منافقین کو کون سمجھائے۔ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ○ یہ بات اس سے پہلے آیت ۳ کے ذیل میں بھی گزر چکی ہے کہ یہ لوگ فہم و شعور سے عاری ہو چکے ہیں۔ (ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ○)

اگلی آیت میں بھی عبداللہ بن اُبی ہی کا ایک قول نقل ہوا ہے۔ فرمایا: "يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ" کہ انہوں نے کہا کہ اگر اس دفعہ ہم مدینہ لوٹ گئے' (یعنی اگر ہم بخیر و عافیت واپس پہنچ گئے) تو یہ بات طے شدہ سمجھو کہ عزت دار لوگ' مراد ہے اہلِ مدینہ یعنی اوس اور خزرج' ان بے وقعت اور کمزور لوگوں کو (یعنی مہاجرینِ مکہ کو) نکال باہر کریں گے۔ یہ روز روز کا جھگڑا اسی صورت میں ختم ہو سکتا ہے

کہ مدینہ کے باعزت باشندے اپنی سرزمین سے ان لٹے پٹے مہاجرین کو بے دخل کردیں۔ اس گستاخی اور جسارت پر سرزنش کے انداز میں فرمایا: "وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ○" حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ عزت تو کل کی کل اللہ کے لئے ہے' اس کے رسول کے لئے ہے اور اہلِ ایمان کے لئے ہے۔ لیکن منافقین کو اس کا علم حاصل نہیں۔ وہ اپنی نادانی میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ عزت دار وہ خود ہیں' حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

یہاں اس سورۂ مبارکہ کا پہلا رکوع ختم ہوتا ہے۔ اس میں گویا کہ مرضِ نفاق' اس کی علامات' اس کا نقطۂ آغاز' اس کا سبب' اس کے مختلف مراتب و مدارج' اس کی ہلاکت خیزی' یہ تمام چیزیں زیر بحث آگئیں۔

دوسرے رکوع کی تین آیات میں ایک عجیب ترتیب نظر آتی ہے۔ جس طرح کہ طب میں ایک مرض کے علاج کی دو شکلیں ہیں۔ ایک حفاظتی (PREVENTIVE) قسم کا علاج ہے' اور دوسرا معالجاتی (CURATIVE) طرز کا۔ یعنی ایک تو وہ تدابیر ہیں کہ جن سے اس مرض کی چھوت سے بچا جا سکے۔ اور دوسرے یہ کہ اگر وہ مرض لاحق ہوجائے' اس کی چھوت لگ جائے تو پھر اس کا مداوا اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدابیر کی جاتی ہیں۔ یہاں دیکھئے کہ مرضِ نفاق کے علاج کے ضمن میں یہ دونوں پہلو سامنے آرہے ہیں۔

نفاق سے بچاؤ کی حفاظتی تدابیر

دوسرے رکوع کی پہلی آیت میں حفاظتی تدبیر کا بیان ہے۔ فرمایا: "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ" ترجمہ: "اے اہلِ ایمان تمہیں غافل نہ کردیں تمہارے مال اور تمہاری اولاد' اللہ کی یاد سے"۔ نفاق سے بچنا چاہتے ہو تو اللہ کو کثرت سے یاد رکھو' اس کی یاد کو اپنے دل میں مستحضر رکھو۔ وہی ذکرِ الٰہی جس کے لئے نماز کا نظام قائم کیا گیا' (اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ)' دن رات میں پانچ مرتبہ اپنے معمولات میں سے نکل کر ایمان کو تازہ کرتے رہو۔ تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ عہد کا یہ سلسلہ برقرار رہنا چاہئے۔ نماز کی ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ کی تلاوت' تجدیدِ ایمان کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔ غور کیجئے' اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ سے ایمان باللہ

کی تجدید ہوگئی۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ○ سے ایمان بالمعاد یعنی ایمان بالآخرت از سرِ نو تازہ ہوگیا۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○ سے اس عہد کی تجدید ہوگئی جو بندے اور رب کے درمیان ہے۔ تو نماز درحقیقت ذکرِ الٰہی کی انتہائی مؤثر اور جامع صورت ہے۔ لیکن اصل میں مقصود یہ ہے کہ "اِستحضارُ اللّٰہِ فِی القَلب" کی یہ کیفیت دائم ہوجائے، مستقل ہوجائے۔ صوفیاء نے اس معاملے کو خصوصی طور پر اپنا موضوع بنایا اور اسے اپنی آخری منطقی انتہا تک پہنچایا ہے۔ پاسِ انفاس کی مسلسل ریاضت اور مشق سے یہ کیفیت بھی پیدا ہوجاتی ہے کہ ذکر کا معاملہ ہر سانس کے ساتھ وابستہ ہوجاتا ہے اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی سانس غفلت میں نہ نکلے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے پیارے انداز میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر سانس جب انسان کے اندر جاتا ہے تو موجبِ تقویت بنتا ہے اور جب باہر نکلتا ہے تو باعثِ تصفیہ ہوتا ہے۔ جسم کے بہت سے خراب بخارات کو لے کر وہ باہر نکلتا ہے اور انسان کے اندرونی نظام کی صفائی کا ذریعہ بنتا ہے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں: "پس بر ہر نفس دو شکر واجب است" کہ پس ثابت ہوا کہ ہر سانس پر دو مرتبہ اللہ کا شکر لازم ہے۔ بہرکیف ان چیزوں میں کچھ مبالغہ نظر آئے تب بھی یہ بات جان لیجئے کہ دوامِ ذکر کے لئے شعوری کوشش کرتے رہنا انسان کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے کہ یہ نفاق سے بچنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اس سے پہلے سورۃ الجمعہ کے درس میں اشارہ کیا جاچکا ہے کہ دوامِ ذکر کی ایک نہایت مفید اور قابلِ عمل صورت یہ ہے کہ انسان "ادعیۂ ماثورہ" کا التزام کرے۔ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعائیں جو آپؐ زندگی کے مختلف اعمال و افعال کرتے ہوئے مانگا کرتے تھے اور اس طرح آپؐ کی زبان پر اللہ کا ذکر دعاؤں کی صورت میں جاری رہتا تھا۔ روز و شب کے معمولات کو ادا کرتے ہوئے قدم قدم پر آنحضورؐ سے دعا ثابت ہے۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی ہے تو ساتھ ہی دعا زبان پر آجاتی ہے، جوتے پہن رہے ہیں تو دعا ہے، سواری پر داہنا پاؤں آگے بڑھا کر چڑھ رہے ہیں تو دعا ہے، اتر رہے ہیں تو دعا ہے، گھر سے نکلے ہیں تو دعا ہے۔ گویا کہ زندگی کے ہر ہر کام کو انجام دیتے ہوئے دعا کی صورت میں اللہ کا ذکر جاری رہتا ہے۔ اس سے معمولات میں قطعاً کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، انسان اپنی زندگی کی مصروفیات میں مشغول رہتے ہوئے بھی ذہن اور قلب کا رشتہ اللہ کے ساتھ

برقرار رکھ سکتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ انسان کے دل پر اپنی تھوتھنی جمائے رکھتا ہے جس سے وہ وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ (اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ○ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ ○) جب تک انسان اللہ کو یاد رکھتا ہے وہ پیچھے ہٹا رہتا ہے اور وسوسہ اندازی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اس آخری سورۃ میں شیطان کے لئے "خناس" کا لفظ آیا ہے۔ "مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ"۔ خنس کہتے ہیں پیچھے ہٹنے کو۔ جب انسان اللہ کو یاد کر رہا ہو' اس کا دل یادِ الٰہی سے آباد ہو تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے لیکن منتظر رہتا ہے کہ جیسے ہی دل پر غفلت طاری ہوجائے تو وہ پھر دل پر اپنا تسلط جمائے اور اپنی تھوتھنی رکھ کر پھونکیں مارنی شروع کردے! لہٰذا کوشش کرو کہ تمہارا کوئی وقت' کوئی لمحہ یاد الٰہی سے اور ذکرِ الٰہی سے خالی نہ ہو۔ یہ ہے مرضِ نفاق سے بچاؤ کی تدبیر۔ یہ ہے وہ حفاظتی ٹیکہ جو نفاق کی چھوت سے انسان کو محفوظ رکھے گا۔

آیت زیرِ بحث کے الفاظ کو ذہن میں لائیے:

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ" یہاں دو چیزوں کو معین کیا گیا ہے کہ جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کرنے کا باعث بنتی ہیں' یعنی مال اور اولاد۔ یہ وہ بات ہے جو ہم سورۃ التغابن میں اس سے قبل پڑھ چکے ہیں۔ گو ہمارے منتخب نصاب میں سورۃ التغابن پہلے ہے اور سورۃ المنافقون کا نمبر بہت بعد میں آتا ہے تاہم مصحف میں سورۃ التغابن اس سورۃ المنافقون کے معاً بعد آتی ہے۔ اس اعتبار سے یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہی مضمون آگے چل کر سورۃ التغابن میں نہایت واضح شکل میں بایں الفاظ آیا ہے:

"اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ" جان لو تمہارے مال اور تمہاری اولاد ہی ذریعۂ آزمائش ہیں۔ یہی تو وہ کسوٹی ہے جس پر تمہیں پرکھا جارہا ہے۔ آیا ان کی محبت اس درجے دل پر مسلط ہوگئی ہے کہ ساری بھاگ دوڑ بس انہی کے لئے ہورہی ہے؟ یا یہ کہ اللہ کی یاد دل میں تازہ ہے' اپنی زندگی کی اصل منزل یعنی آخرت ذہن میں مستحضر ہے' اصل توجہ اپنے خالق اور مالک اور آقا کی طرف ہے۔ یہی تو وہ کسوٹی ہے جس پر تم جانچے اور پرکھے جارہے ہو۔ چنانچہ متنبہ کر دیا گیا کہ اے اہلِ ایمان' دیکھنا' تمہیں یہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کردیں۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۂ نور

میں بھی آچکا ہے۔ وہاں اللہ کے کچھ نیک بندوں کی تعریف میں مثبت انداز میں یہ بات آئی تھی: "رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللّٰهِ"۔ وہ جواں مرد' وہ باہمت لوگ جنہیں کوئی کاروبار دنیوی' کوئی تجارت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔ اور اگر کوئی شخص ان چیزوں کی محبت سے مغلوب ہو کر اللہ کی یاد سے غافل ہوگیا تو اس کے بارے میں فرمایا: "أُولٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ○" یہی ہیں جو خسارہ پانے والے ہیں۔

نفاق کا علاج: انفاق

یہ تو ہوئی حفاظتی تدبیر جس کو ایک لفظ میں اگر بیان کریں تو وہ ہے "دوامِ ذکرِ الٰہی"! لیکن اگر کہیں اس مرض کی چھوت لگ گئی ہو تو اس بارے میں جو تجزیہ ہم کر چکے ہیں اس کی رو سے اس کا اصل سبب ہے مال و دولت دنیا کی محبت! یہی وہ محبتیں ہیں جو انسان کو نفاق کے راستے پر ڈالتی ہیں۔ اللہ کی راہ سے انسان اگر رکتا ہے تو اصل میں انہی محبتوں کے باعث۔ لہٰذا اب اس کا علاج اسی طور پر ہوگا کہ مال کی محبت کو دل سے کھرچنے کی کوشش کی جائے۔ انسان چاہتا ہے کہ اس مال کو جو اسے بہت محبوب ہے' روک روک کر اور سینت سینت کر رکھے۔ سورۃ المعارج میں ہم پڑھ چکے ہیں: "إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا○ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا○ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا○" کہ انسان بہت ہی تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے' جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو واویلا کرتا ہے اور جب خیر پہنچتا ہے' مال میسر آتا ہے تو اسے روک روک کر رکھتا ہے۔ یہ انسان کی طبیعت ہے۔ اسی سے اس کے دل کی کلی کھلتی ہے۔ لہٰذا فرمایا: "وَأَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنٰكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ" کہ خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تمہیں عطا کیا' اس سے پہلے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچے۔ اس مال کو صرف کرو' اس کو خرچ کرو' اللہ کی راہ میں لگا دو۔ اس طرح قلب کی صفائی ہوگی' مال کی محبت کا زنگ دھلے گا' اسی سے تزکیہ ہوگا۔ سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات میں بھی یہ مضمون آچکا ہے۔ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُونَ۔ تزکیۂ عمل' تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے لئے درحقیقت سب سے مؤثر تدبیر یہی ہے کہ اس مال کو اللہ کی راہ میں لگاؤ اور خرچ کرو۔ اسی کا نام ہے انفاق فی سبیل اللہ۔

یہاں ایک بات اور نوٹ کر لیجئے کہ انفاق کے بارے میں عام تصور تو یہی ہے کہ اس سے مراد ہے انفاقِ مال' اور قرآن مجید میں بھی اکثر و بیشتر مال کے صرف کرنے کے لئے ہی

یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن انفاق کا لفظ جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' عام ہے اور اس کے مفہوم میں خاصی وسعت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ "نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ" کی طرح "نَفَقَ الْفَرَسُ" بھی مستعمل ہے۔ گویا کسی کام میں اپنی جان' اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کا کھپانا اور اوقات کا صرف کرنا' انفاق کا لفظ ان سب کو محیط ہے۔ اس لئے کہ رزق بھی ایک نہایت وسیع اصطلاح ہے۔ انسان کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ اس کا رزق ہے۔ اس کا نصیب' اس کی ذہانت' اس کی صلاحیتیں' یہ سب رزق میں شامل ہیں۔ کوئی بھاگ دوڑ زیادہ کر سکتا ہے' کوئی منصوبہ بندی بہتر کر سکتا ہے۔ آج کے دور میں علمِ معاشیات نے جو وسعت اختیار کی ہے' اس کے اعتبار سے اب یہ بات معروف ہے کہ یہ سب چیزیں CAPITAL یعنی سرمایہ شمار ہوتی ہیں۔ انہی صلاحیتوں سے تو سرمایہ کمایا جاتا ہے۔ یہ INTERCONVERTIBLE ہیں۔ لہٰذا انفاقِ مال میں بذلِ نفس یعنی انفاقِ نفس بھی شامل ہے۔ جو کچھ انسان کو دیا گیا ہے اس میں سے ایک قابلِ ذکر حصہ اللہ کی راہ میں لگائے اور کھپائے۔ یہ گویا کہ علاج بالضد ہے کہ جس چیز سے محبت ہے' اسی کو خرچ کرو اور اللہ کے راستے میں لگادو۔ یہی بات چوتھے پارے کے آغاز میں بیان ہوئی ہے: "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" کہ تم نیکی اور وفاداری کا مقام حاصل کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ خرچ نہ کرو وہ چیز جو تمہیں محبوب ہے' جسے تم پسند کرتے ہو۔ یہی بات آیۃ البر میں ایک مختلف اسلوب میں بیان ہوئی ہے: "وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ" کہ انسان مال کو خرچ کرے اس کی محبت کے علی الرغم۔

حسرت بوقت مرگ

یہاں سورۃ المنافقون کے آخری حصے میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ایک بڑا حسرت کا وقت آئے گا جب انسان کفِ افسوس ملے گا کہ اے کاش میں اس مال کو اللہ کی راہ میں صدقہ کر سکتا۔ آج یہ لوگ دونوں ہاتھوں سے مال جمع کر رہے ہیں' گھروں کی آرائش و زیبائش پر بے تحاشا خرچ ہو رہا ہے' ان میں نامعلوم کہاں کہاں سے فرنیچر اور کراکری جمع کی گئی ہے' یہ سب چیزیں انسان کو بڑی محبوب ہیں (وَمَسٰكِنَ تَرْضَوْنَهَآ۔ سورۃ التوبہ' آیت ۲۴) لیکن ایک وقت آئے گا جس کے بارے میں سورۃ القیامہ میں ہم پڑھ چکے ہیں "وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ" کہ وہ فراق کا وقت ہوگا۔ مال و دولت اور جائداد' سب کو چھوڑ کر جانا

(باقی صفحہ ۷۹ پر)

فکر اقبال کی تعمیل کا تاریخی جائزہ

(تفکر و تذکر ــــ بشکریہ نوائے وقت)

سب جانتے ہیں کہ انقلاب فرانس کو فکری غذا والٹیئر اور روسو اور بعض دیگر مصنفین نے فراہم کی تھی' تاہم انقلاب کی قیادت تو کجا' اس کی عملی جدوجہد میں بھی ان میں سے کسی کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اسی طرح انقلابِ روس کے لئے فکری مواد مارکس اور اینجلز نے جرمنی اور انگلستان میں بیٹھ کر تیار کیا تھا' تاہم نہ صرف یہ کہ ان میں سے کوئی بھی مردِ میدان نہ تھا' بلکہ ان دونوں ملکوں میں تو کمیونسٹ انقلاب کی کوئی آواز کبھی بلند ہی نہ ہو سکی۔ اور اشتراکی انقلاب بالفعل روس میں بالشویک اور مانشویک لوگوں کی جدوجہد اور لینن کی اتفاقیہ قیادت کے ذریعے برپا ہوا ــــ خود مسلمانوں کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ دورِ صحابہؓ کے بعد' سوائے ایک امام ابنِ تیمیہؒ کے' جتنے لوگ علم و فکر اور قلم و قرطاس کے میدان میں نمایاں ہوئے ان میں سے کوئی بھی سیف و سناں کا حامل نہ ہوا۔ چنانچہ دوسری صدی ہجری کے مجدد اعظم امام ابو حنیفہؒ نے بھی اگرچہ حضرت نفس زکیہؒ کی اخلاقی تائید بھی کی اور ان کے ساتھ مالی تعاون بھی کیا لیکن عملاً جہاد و قتال میں شرکت نہیں کی۔ اسی طرح امت کی تاریخ کے دوسرے ہزار سالہ دور (الف ثانی) کے آغاز پر دو عظیم ترین مجددوں یعنی شیخ احمد سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مساعی بھی صرف قلم و قرطاس کی خدمت یا باطنی اور روحانی اصلاح تک محدود رہیں۔

علی ہذا القیاس' اگر علامہ اقبال مرحوم نے بھی صرف اسلام کے انقلابی فکر کی

تجدید کا کارنامہ سرانجام دیا اور خود عملی طور پر نہ کسی تحریک کا آغاز کیا نہ کسی جماعت کی تاسیس کی تو اس میں ہرگز نہ کوئی تعجب کی بات ہے، نہ ہی اس سے ان کی ذات اور شخصیت پر کوئی حرف آتا ہے۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح گذشتہ صدی کی عظیم تحریک مجاہدینؒ فی الواقع شاہ ولی اللہؒ ہی کی تجدیدی مساعی کا ظہور تھی، اسی طرح اگر ذرا بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ بیسویں صدی عیسوی کی جملہ احیائی مساعی کی بنیاد میں بھی علامہ اقبال ہی کا فکر کار فرما ہے۔ اور اگر اللہ کو منظور ہوا اور سلطنت خداداد پاکستان اسلام کی "نشأۃ ثانیہ" کا گہوارہ اور عالمی نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نقطۂ آغاز بنی، اور اس کے لئے یہاں منہجِ نبویؐ پر کوئی انقلاب برپا ہوا، جس کے تاریخی شواہد بہت قوی ہیں (اگرچہ موجود الوقت احوال و کیفیات کی بنا پر گاہ بگاہ مایوسی اور بددلی کے آثار بھی پیدا ہوجاتے ہیں!) تو اس کی اصل اساس علامہ اقبال کے اسی "کارنامے" پر ہوگی جو انہوں نے اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید کی صورت میں سرانجام دیا ـــــ تاہم اس حقیقت کے کماحقہ ادراک کے لئے ضروری ہے کہ پہلے علامہ مرحوم کی شخصیت کو تاریخ کے فریم میں فٹ کرلیا جائے۔

علامہ اقبال کی ولادت ۱۸۷۷ء میں اسی سال ہوئی جس سال مسلم انڈیا میں ایک نئی فکری اور سیاسی روایت کے بانی اور موجد سرسید احمد خان کے ہاتھوں ایم اے او کالج علی گڑھ کی تاسیس ہوئی۔ (اس سے قبل سرسید مرحوم علی گڑھ ہی میں ۱۸۶۶ء میں "سائنٹفک سوسائٹی" اور ۱۸۷۵ء میں ایم اے او ہائی اسکول قائم کرچکے تھے۔) پھر علامہ کی شاعری کا آغاز لگ بھگ اس وقت ہوا جب سرسید کی زندگی کا چراغ گل ہوا چاہتا تھا۔ سرسید کا انتقال ۱۸۹۸ء میں ہوا تھا اور علامہ اقبال اگرچہ لاہور کے حلقۂ شعر و ادب میں تو ۱۸۹۵ء ہی سے متعارف ہوچکے تھے تاہم ان کی وہ پہلی نظم جس کے ذریعے وہ ہندوستان کے وسیع تر علمی و ادبی حلقوں میں متعارف

ہوئے "ہمالہ" ہے جو اپریل ۱۹۰۱ء میں آنریبل سر عبدالقادر کے جاری کردہ ماہنامے "مخزن" کی پہلی اشاعت میں شائع ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں علامہ کا پہلا اردو مجموعہ کلام "بانگِ درا" شائع ہوا تو اس کا "دیباچہ" بھی ان ہی سر عبدالقادر نے لکھا جس میں انہوں نے علامہ کی شاعری کو بجا طور پر تین ادوار میں منقسم قرار دیا (واضح رہے کہ "بانگِ درا" سے قبل علامہ کے فارسی کلام پر مشتمل تین کتابیں شائع ہو چکی تھیں، یعنی ـــــ اسرارِ خودی ۱۹۱۵ء میں، رموزِ بیخودی ۱۹۱۸ء میں، اور پیامِ مشرق ۱۹۲۳ء میں!)

علامہ کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۰۵ء تک ہے جس میں وہ زیادہ تر حالی کی "نیچرل شاعری" کے انداز میں انگریزی شعراء کا اتباع کرتے اور ہندی قومیت کا راگ الاپتے نظر آتے ہیں۔ دوسرے دور میں (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) وہ اردو اور فارسی شاعری کے روایتی مضامین یعنی گل و بلبل، حسن و عشق، اور فراق و وصال کی دشت پیمائی کرتے نظر آتے ہیں ـــــ لیکن ۱۹۰۸ء میں جیسے ہی ان کی حیاتِ مستعار کی چوتھی دہائی کا آغاز ہوتا ہے، ان کی "ملی شاعری" کا دور بھی بھرپور انداز میں شروع ہو جاتا ہے۔ اور اب وہ مسلمانوں کی وحدتِ ملی کے ترانے گاتے، اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر آنسو بہاتے، لیکن ساتھ ہی ان دونوں کے احیاء اور عروجِ نو کی نوید جانفزا سناتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے پہلی دونوں حیثیتوں میں وہ شبلی اور حالی کی روایت کے تسلسل کی حیثیت رکھتے ہیں (جو خود اپنی جگہ آسمان سرسید ہی کے ستارے تھے) یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۴ء میں حالی کے انتقال پر انہوں نے کہا: ۔

خاموش ہوگئے چمنستاں کے رازدار
سرمایہ گداز تھی جن کی نوائے درد!

اور۔

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں
حالی بھی ہوگیا سوئے فردوس رہ نورد!

—— لیکن تیسری حیثیت میں، یعنی اسلام کے احیاء و تجدید کے علمبردار اور مسلمانوں کے عروجِ نو کے مبشراور نقیب ہونے کے اعتبار سے وہ بالکل "منفرد" بھی ہیں اور ایک نئے دور کے "فاتح" یعنی افتتاح کرنے والے بھی!

جیسے کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے وہ بنیادی طور پر "مردِ میدان" نہیں بلکہ ایک مفکر و مصور اور حکیم و دانا انسان تھے، لہٰذا فکر اور فلسفہ کی سطح پر انہوں نے جن بلندیوں کو چھوا، (اس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ جو شعر انہوں نے غالب کے بارے میں کہا تھا اس کے مصداقِ کامل واتم وہ خود ہیں—— یعنی: "فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا۔ ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا!") اور جس وسعتِ نظر کا ثبوت دیا، اور اس سے بھی بڑھ کر "آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر" نہ صرف خود دیکھی بلکہ دوسروں کو بھی دکھائی اس کے مقابلے میں عمل کے میدان میں ان کا مقام زیادہ بلند اور نمایاں نظر نہیں آتا۔ (بقول خود ان کے کہ ع "گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا!"—— تاہم انہوں نے مسلمانانِ ہند کو اپنے جداگانہ قومی تشخص کا احساس و شعور عطا کرنے میں جو عظیم کامیابی حاصل کی (اس اعتبار سے راقم الحروف کے نزدیک وہ مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے ظل اور بروز کی حیثیت رکھتے ہیں۔) اور اس سے بھی بڑھ کر ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الہ آباد کے ذریعے ان کی قومی جدوجہد کے لئے جو منزلِ مقصود اور نصب العین معین کیا، اور ان سب پر مستزاد مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں جس طرح ایک عام کارکن کی طرح حصہ لیا، اس کے پیشِ نظر وہ عمل کے میدان میں بھی بالکل خالی ہاتھ نہیں ہیں اور پاکستان کے قیام میں ان کا حصہ کسی دوسرے قائد سے ہرگز کم نہیں ہے!

لیکن دوسری جانب احیاءِ دین اور "طلوعِ اسلام" کا جو زبردست صور انہوں نے پھونکا تھا برِّعظیم پاک و ہند کی پوری اسلامی تحریک فی الحقیقت اسی کی مرہونِ منت ہے اور خود اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ ۔

"تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!"

بیسویں صدی عیسوی میں برِعظیم ہند و پاک میں احیاءِ اسلام کا جو غلغلہ بلند ہوا وہ سب اسی مردِ درویش کا فیض ہے جسے ہم اوپر حضرت مجددؒ کا ظل قرار دے چکے ہیں۔

تجدید و احیائے دین کے عملی میدان میں اگرچہ آغاز میں سرسید مرحوم کے مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے متعدد اہم اشخاص "حکومتِ الٰہیہ" کے زور دار نعرے کے ساتھ اترے لیکن کچھ حالات کی ناموافقت اور کچھ اپنی استقامت کی کمی کے باعث سب کے سب ناکام ہوگئے۔ چنانچہ ان میں سے بعض تو فوراً ہی منظر سے غائب ہوگئے، جیسے خیری برادران، اور بعض نے اپنے جوش اور جذبے اور تنظیمی و عسکری صلاحیت کی بنا پر کچھ عرصے کے لئے بڑا سماں باندھا، جیسے علامہ مشرقی، لیکن وہ واحد شخصیت جس سے ایک ایسی نئی روایت کا آغاز ہوا جس کا تسلسل خود اس کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد بھی قائم رہا مولانا ابوالکلام آزاد کی تھی، اور اگرچہ یہ نہ خود انہوں نے کبھی تسلیم کیا، نہ ان کا کوئی عقیدت مند آج تسلیم کرے گا کہ انہوں نے کوئی اثر علامہ اقبال سے قبول کیا تھا، لیکن اگر ذرا شخصی محبت و عقیدت کے پردے ہٹا کر حقیقت پسندانہ نگاہ سے دیکھا جائے، اور زمان و مکان کے ناقابل تردید حقائق کو پیشِ نظر رکھا جائے تو صاف محسوس ہوگا کہ ۱۹۰۸ء میں جب اقبال کی ملی شاعری کا ڈنکا بجنا شروع ہوا احمد المکنی بابی الکلام کی عمر کل بیس برس تھی۔ گویا یہ اس ذہین اور طباع نوجوان کی زندگی کا سب سے زیادہ حساس اور اخاذ دور تھا، تو کیسے ممکن ہے کہ اس کے ذہن و فکر کی تشکیل میں اس "بانگِ درا" اور "بانگِ رحیل" کا کوئی حصہ نہ ہو جو اقبال کی ملی شاعری کی صورت میں برِعظیم کے پورے طول و عرض میں گونج رہی تھی، خصوصاً جبکہ اس کی ابتدائی تربیت میں مؤثر حد تک عمل دخل آسمانِ سرسید کے ایک ٹوٹے ہوئے تارے علامہ شبلی کو بھی حاصل تھا!

بہرحال اس وقت نہ اس پر زیادہ بحث کا موقع ہے کہ مولانا آزاد کے قلب و ذہن میں احیاءِ اسلام کا جذبہ و ارادہ علامہ اقبال کی ملی شاعری کے زیرِ اثر پیدا ہوا تھا یا یہ براہ راست ع "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں!" کی صورت تھی یا پھر "توارد باہمی" والا معاملہ تھا۔ اس وقت جس حقیقت کی جانب توجہ دلانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے ابوالکلام کی شخصیت اور کارنامے کو اگر دو حصوں میں تقسیم کرلیا جائے تو ان میں سے ایک کو تو ان کے اور علامہ اقبال کے مابین قدرِ مشترک کی حیثیت حاصل ہے اور فرق صرف اسلوب اور انداز کا ہے، البتہ دوسرا حصہ کم از کم ظاہری اور عملی اعتبار سے قدرے مختلف اور، جیسے کہ اوپر عرض کیا گیا، ایک نئی روایت کے نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان میں سے مقدم الذکر حصہ یعنی امتِ مسلمہ کی زبوں حالی اور اولاً جنگِ بلقان اور پھر پہلی عالمگیر جنگ کے دوران مسلمانوں پر دُوَلِ یورپ کے مظالم پر مرثیہ خوانی، اور عظمتِ قرآن کے بیان اور اس کی جانب مؤثر اور زور دار دعوت کو علامہ اقبال اور مولانا آزاد کے مابین قدرِ مشترک کی حیثیت حاصل ہے۔ اور ان میں سے بھی ظاہر ہے کہ احیاءِ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے زیادہ اہمیت دوسری بات کی ہے، اور اس کے ضمن میں ان دونوں کے مابین ایک اعتبار سے تو صرف اسلوب اور انداز کا فرق ہے، یعنی جہاں اقبال نے قرآن کو اپنے اشعار میں "سمو" دیا، وہاں آزاد نے اسے اپنی نثر کی روحِ رواں بنا دیا۔ (اور واقعہ یہ ہے کہ اسی سے آزاد کی نثر کو یہ حیثیت حاصل ہوئی کہ حسرت موہانی ایسا شخص پکار اٹھا کہ ۔ "جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر۔ نظمِ حسرت میں کچھ مزا نہ رہا!") اسی طرح جہاں اقبال کے یہاں "فکر" کا پلڑا بھاری ہے وہاں آزاد کے یہاں "دعوت" کا انداز غالب ہے ـــــ البتہ ایک دوسرے پہلو سے راقم اپنا یہ تاثر بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "عظمتِ قرآن" کے انکشاف کی جو شدت وحدّت اور گہرائی و گیرائی اقبال کے یہاں نظر آتی ہے اس کی دوسری مثال کم از کم راقم کے علم میں نہیں ہے۔

البتہ مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے متذکرہ بالا آٹھ سالہ دور کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ "منفرد" ہیں۔ یعنی اقبال نے اللہ کی حاکمیت اور "نورِ توحید کے اتمام" کا جو نعرہ لگایا اور ملتِ بیضا کی از سرِ نو "شیرازہ بندی" اور ع "یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!" کی جو نوید جانفزا سنائی' اس کے لئے عملی جدوجہد کے ضمن میں "راست اقدام" کے ناگزیر تقاضوں کی تعمیل اور تکمیل کی جانب توجہ دلانے کے ساتھ ساتھ پہلا عملی قدم ابوالکلام نے اٹھایا۔

اس سلسلے میں انہوں نے جہاں فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت' حکومت الٰہیہ اور خلافتِ اسلامیہ کے قیام کی فرضیت' اور اس کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کے لزوم کو اپنی تحریر اور تقریر کے اہم موضوعات کی حیثیت دی وہاں' واقعہ یہ ہے کہ' دو عظیم حقیقتوں کی جانب مسلمانوں کی توجہ مبذول کرانا تو ان کا پوری امتِ مسلمہ پر بالعموم اور حال اور مستقبل کی تمام احیائی تحریکوں پر بالخصوص عظیم احسان ہے۔ یعنی (۱) ایک یہ کہ یہ کام ایک منظم اور سمع و طاعت کی خوگر جماعت کے قیام کے بغیر ناممکن ہیں اور (۲) دوسرے یہ کہ مستقبل کا "اسلامی انقلاب" بھی صرف اسی طریقۂ کار پر عمل پیرا ہو کر برپا کیا جاسکتا ہے جس کے ذریعے چودہ سو سال قبل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انقلاب جزیرہ نمائے عرب میں برپا کیا تھا!

ان میں سے پہلی بات کے لئے تو انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مبارک کا حوالہ دیا جو مشکوٰۃ شریف میں مسند احمدؒ اور جامع ترمذیؒ کے حوالے اور حضرت حارث اشعریؓ کی روایت سے موجود ہے' یعنی: آپؐ نے فرمایا: "مسلمانو! میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ (ایک روایت میں یہ اضافی الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں: "مجھے ان کا حکم اللہ نے دیا ہے") یعنی جماعت کا حکم' سننے کا حکم' اطاعت کا حکم' ہجرت کا حکم' اور جہاد فی سبیل اللہ کا حکم!" ان پانچ باتوں کا تعلق اسلامی حکومت یا نظامِ خلافت کے ساتھ تو اظہر من الشمس ہے۔ یعنی اگر اسلامی حکومت یا نظامِ خلافت قائم ہو تو ان پانچوں احکام پر عمل لازمی طور پر خود بخود ہوتا

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک عالمِ اسلام میں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں (خواہ ملوکیت ہی کی صورت میں) قائم رہیں ان پانچ احکام کا حوالہ بھی کسی نہ کسی درجہ اور حیثیت میں برقرار رہا۔ لیکن جب مسلمان ممالک پر غیر مسلم اقوام کی حکومتیں قائم ہو گئیں تو یہ پانچوں احکام بھی غیر متعلق اور رفتہ رفتہ "آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل" کے مصداق ذہن سے محو ہوتے چلے گئے۔ اور کسی کو یہ خیال ہی نہ آیا کہ اس حدیثِ مبارک میں اسلامی حکومت یا نظامِ خلافت کے از سرِ نو قیام کی جدوجہد کے ضمن میں بھی بنیادی رہنمائی موجود ہے ـــــ چنانچہ جب ۱۹۱۲ء میں یہ حدیث "الہلال" میں شائع ہوئی تو بہت سے مسلمان چونک گئے اور انہیں گویا اپنا بھولا ہوا سبق یاد آگیا۔ بہرحال مولانا آزاد نے مسلمانانِ ہند کو اس حدیث مبارک کی جانب صرف متوجہ ہی نہیں کیا بلکہ ۱۹۱۳ء میں اسی پر عمل کرتے ہوئے بیعت کی اساس پر "حزب اللہ" کے نام سے ایک جماعت بھی قائم کردی۔

دوسری بات کے لئے مولانا آزاد نے اولاً ۱۹۱۲ء ہی میں امام دار الہجرۃ حضرت مالک ابن انسؒ کے اس قول کا حوالہ دیا کہ: "اس امت کے آخری حصے کی اصلاح ہرگز نہ ہوسکے گی مگر صرف اسی طریق پر جس پر پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی" ـــــ اور پھر دوبارہ لگ بھگ دس سال بعد نومبر ۱۹۲۱ء میں جمعیت علماءِ ہند کے تیسرے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں اپنے تحریری خطبے میں اس کا حوالہ دیا۔ اب سے تقریباً دس سال قبل جب "منہجِ انقلابِ نبوی" راقم کی تحریر اور تقریر کا خاص موضوع بنا تو اس کے ضمن میں مولانا آزاد کے حوالے سے امام مالکؒ کا یہ قول بھی بہت نقل ہوا۔ اس پر بعض بزرگوں نے توجہ دلائی کہ اس قول مبارک کی حیثیت بھی حدیث کی ہے۔ اس لئے کہ یہ اصلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس خطبے میں وارد ہوا ہے جو انہوں نے اپنی حیاتِ دنیوی کے آخری ایام میں ارشاد فرمایا تھا اور جس کے ذریعے خلافت کے لئے حضرت عمرؓ کی نامزدگی ہوئی تھی۔

الغرض، میرے نزدیک ۱۹۱۳ء میں "حزب اللہ" کا قیام علامہ اقبال کے انقلابی فکر کی تعمیل کی جانب پہلا قدم تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مولانا آزاد اس پر صرف آٹھ سال تک استقامت کا مظاہرہ کر سکے۔ اور انہوں نے خود اپنے قول کے مطابق تو ان علماء کی مخالفت کے باعث پٹڑی تبدیل کر لی جن کے دینی تصورات بارہ سو سالہ زوال و انحطاط کے باعث صرف عبادات و رسومات اور اس سے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ نکاح و طلاق اور میراث کے مسائل تک محدود ہو کر رہ گئے تھے—— چنانچہ اپنے ایک سرگرم رفیق اور جانثار ساتھی مولانا محی الدین قصوری مرحوم کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: "میں اپنے پندرہ سال کے طلب و عشق کے بعد وقت کے عدم مساعدت و استعداد کا اعتراف کرتا ہوں.... میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ موجودہ طبقہ علماء سے میں بالکل مایوس ہوں اور اس کو قوانینِ اجتماعی کے خلاف سمجھتا ہوں کہ ان کے جمود میں کسی قسم کا تقلب و تحول پیدا ہو..." لیکن بعض دوسرے حضرات (جن میں ان کے بعض عقیدت مند ہی نہیں بیعت کرنے والے بھی شامل ہیں) کے نزدیک اس کا اصل سبب مولانا کی اپنی کم ہمتی تھی۔ یہاں تک کہ ان کے ایک دوسرے مخلص رفیق اور مولانا محی الدین قصوری ہی کے برادر اصغر مولانا محمد علی قصوری نے یہ الفاظ تک لکھ دئے کہ: "..... لیکن عین وقت پر مولانا آزاد کی بزدلی نے تمام کھیل بگاڑ دیا اور وہ سارے کا سارا محل جس کی تعمیر پر لاکھوں روپیہ صرف ہوا تھا اور سینکڑوں مسلمانوں نے اسے اپنے خون سے سینچا تھا، مولانا کی گریز پائی کی وجہ سے آن کی آن میں دھڑام سے نیچے آن گرا۔" (ان دونوں حوالوں کے لئے دیکھئے "تحریک نظمِ جماعت" تالیف ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری، صفحات ۱۰۱ و ۱۰۴ اور ۱۰۵)—— بہرحال جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس بحث کے فیصلے کی تو نہ گنجائش ہے نہ ضرورت—— اصل بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کے انقلابی فکر کی تعمیل کے لئے "راست اقدام" کی سعی اول ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ختم ہو گئی، لیکن اس فکر کی روحِ باطنی اور قوتِ متحرکہ نے بہت جلد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی

صورت میں نیا پیکر تلاش کر لیا جن کے فکرِ اقبال سے اثر پذیر ہونے کا معاملہ ویسے بھی اظہر من الشمس ہے، مزید برآں اس کا یہ تاریخی ثبوت تو ناقابل تردید ہے ہی کہ انہیں علامہ اقبال نے جنوبی ہند سے شمالی ہند نقل مکانی کی صرف دعوت ہی نہیں دی تھی، اس سلسلے میں ان کے ساتھ عملی تعاون بھی کیا تھا۔

یہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ اگرچہ بیسویں صدی عیسوی میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید اور احیاء کا سہرا تمام تر علامہ اقبال کے سر ہے، تاہم انہوں نے اپنی عملی مساعی کو صرف مسلمانانِ ہند کی اس قومی تحریک کی تائید اور تقویت تک محدود رکھا جو سر سید احمد خان مرحوم کے مکتبِ فکر کے تحت شروع ہوئی تھی۔ اور خود اسلام کے احیاء اور غلبے کی براہِ راست جدوجہد کے لئے نہ کسی تحریک کا آغاز کیا نہ کوئی جماعت بنائی۔ البتہ اس حقیقت کو نگاہوں سے ہرگز اوجھل نہیں ہونے دینا چاہئے کہ حضرت علامہ نے اپنے ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد کے ذریعے مسلمانانِ ہند کی متذکرہ بالا قومی تحریک کو ایک معین سمت اور واضح منزل کا شعور عطا کر کے اس میں صرف نظریاتی ہی نہیں "احیائی" رنگ کی آمیزش بھی کر دی تھی۔ چنانچہ اپنے اس تاریخ ساز خطبے میں انہوں نے جہاں مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کا مدلل اور فلسفیانہ انداز میں اثبات کیا، اور یہ پیشینگوئی بھی کی کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں ایک آزاد مسلم ریاست کا قیام "تقدیرِ الٰہی" ہے، وہاں یہ فرما کر کہ: "اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کے چہرۂ روشن پر جو تاریک پردے عرب ملوکیت کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر عالمِ انسانیت کو اس کی اصل تعلیمات سے روشناس کرا سکیں!" خلافتِ راشدہ یا "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے قیام کو مسلمانانِ ہند کی قومی جدوجہد کا نصب العین قرار دیدیا تھا، اس لئے کہ دورِ ملوکیت سے قبل کا اسلام، ظاہر ہے کہ، دورِ نبوت اور خلافتِ راشدہ کا اسلام ہی تھا۔ چنانچہ کون نہیں جانتا کہ بعد میں یہی نظریاتی اپیل اور احیائی جذبہ مسلمانانِ ہند کو

"پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!" کے نعرے کے تحت مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے کا ذریعہ بن گیا، جس کے نتیجے میں قیامِ پاکستان کا "معجزہ" صادر ہو گیا۔

تاہم یہ باتیں تو بہت بعد کی ہیں، اقبال کی ملی شاعری کا ڈنکا تو ۱۹۰۸ء ہی سے بجنا شروع ہو گیا تھا۔ اور اس سے جو احیائی جذبہ بیدار ہوا تھا اس نے مختلف پیکر اختیار کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ان میں اولاً جو داعی اور قائد سامنے آئے ان میں اہم ترین شخصیت ابوالکلام آزاد کی تھی اور جب ۱۹۲۰ء کے بعد وہ منظر سے ہٹ گئے تو جو دوسری شخصیت سامنے آئی اور جس کے نام کا شہرہ مشرق و مغرب میں ہوا وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تھی۔

مولانا مودودی کی ولادت ۱۹۰۳ء میں ہوئی تھی۔ گویا علامہ اقبال سے تو وہ چھبیس برس چھوٹے تھے اور اس طرح ان دونوں کے مابین تو پوری ایک نسل کا واضح فصل تھا۔ البتہ جہاں تک مولانا آزاد کا تعلق ہے تو اگرچہ "عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ" (بنی اسرائیل ۱۲) کے اعتبار سے تو وہ ان سے صرف پندرہ برس چھوٹے تھے لیکن چونکہ مولانا آزاد بہت نوعمری میں نمایاں ہو گئے تھے (چنانچہ صرف چوبیس برس کی عمر میں مطلعِ ہند پر "الہلال" کی صورت میں نمودار ہو چکے تھے!) لہٰذا ان دونوں کے مابین بھی معنوی فصل کم و بیش بیس سال کا تھا ــــــ بہرحال جب ۱۹ــ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ نوجوان ابوالاعلیٰ نے شعور کی آنکھ کھولی تو اس وقت ہندوستان کی فضا میں ایک جانب حکیم الامت علامہ اقبال کی نہ صرف ملی شاعری اور اس سے پیدا شدہ احیائی جذبے کی دھوم تھی بلکہ ان کا "فلسفۂ خودی" بھی پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آچکا تھا جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نظریۂ "وحدت الشہود" کے ظل کی حیثیت رکھتا ہے اور جس نے ہمہ اوستی خیالات اور وجودی تصوف کی جڑ کاٹ کر "فنا فی اللہ" کی بجائے "بقا باللہ" کو سلوک کے مقصود اور مطلوب کی حیثیت دیدی تھی۔ اور "اسرارِ خودی" کے بعد "رموزِ بیخودی" کے ذریعے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت،

محبت اور اتباع کو اصل الاصول قرار دے کر اسلام کے جداگانہ ملی تشخص کو از سرِ نو مستحکم کردیا تھا۔ اور دوسری طرف الہلال اور البلاغ کے مدیر' حزب اللہ کے امیر' "دار الارشاد" کے بانی' اور قرآن اور جہاد فی سبیل اللہ کے داعی ابوالکلام آزاد کی شخصیت کا سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ چنانچہ جواں سال ابوالاعلیٰ نے ان دونوں اعاظم رجال سے بھرپور استفادہ بھی کیا اور گہرا تاثر بھی قبول کیا۔ اور اس طرح "مجمع البحرین" کی حیثیت اختیار کر کے ان دونوں کے مشن کی تکمیل کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔

علامہ اقبال کے اتباع میں مولانا مودودی نے مغربی تہذیب کے اصول و مبادی اور اس کے۔

"نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!"

کے مصداق نگاہوں کو چکا چوند کرنے والے مظاہر کو پوری خود اعتمادی کے ساتھ چیلنج کیا۔ اور اپنے سلیس' عام فہم اور دل نشین اندازِ بیان اور اسلوبِ نگارش کے ذریعے "اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی" (واضح رہے کہ یہ مولانا کی ایک اہم اور ابتدائی تالیف کا نام ہے) کی مفصل وضاحت اور مدلل اثبات کا فریضہ باحسن وجوہ سرانجام دیا۔ چنانچہ اسلام کے معاشرتی نظام پر "پردہ" اور اسلام کی اقتصادی تعلیمات کے موضوع پر "سود" ایسی مبسوط کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ رہیں اسلام کی سیاسی تعلیمات تو اگرچہ ان کے ضمن میں ان کا مختصر کتابچہ "اسلام کا نظریہ سیاسی" ضخامت کے اعتبار سے "بقامتِ کہتر" کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اپنے پختہ اور محکم استدلال کی بنا پر یقیناً "بقیمتِ بہتر" کا مصداق کامل ہے۔ اور ہر صاحبِ نظر جانتا ہے کہ ان جملہ امور میں مولانا مودودی کی اصل حیثیت علامہ اقبال کے شارح اور مفسر کی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ حضرت علامہ ہی کے اتباع میں مولانا مودودی نے بھی

مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کا پر زور اور مدلل اثبات کیا اور اس طرح وہ بھی مسلمانانِ ہند کی قومی جدوجہد کی تقویت کا ذریعہ بنے۔ اور چونکہ ادھر جمعیت علماءِ ہند ایسی طاقتور اور اثر و رسوخ کی حامل جماعت اور اس پر مولانا آزاد کی بھاری بھرکم شخصیت بھی پٹڑی بدلنے کے بعد انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہونے کے باعث "متحدہ قومیت" کی زور دار حمایت اور تائید کر رہے تھے، اور ادھر حضرت علامہ علالت کے باعث کسی قدر پس منظر میں جا چکے تھے لہٰذا واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں متحدہ قومیت کی مخالفت اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے اثبات کے میدان میں سب سے مؤثر اور فیصلہ کن کردار مولانا مودودی کے قلم ہی نے ادا کیا۔ اور ان کی تالیفات "مسئلہ قومیت" اور "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے حصص اول و دوم کو اس وقت کی قومی تحریک کے اہم ترین ہتھیاروں کی حیثیت حاصل ہو گئی ـــــ چنانچہ مولانا مودودی کے اسی قلمی جہاد کی بنا پر علامہ اقبال کی عقابی نگاہ ان پر پڑی اور انہوں نے انہیں دکن کی سنگلاخ زمین سے "اچک" کر اپنے خوابوں کی سرزمین یعنی مستقبل کے پاکستان کے زرخیز ترین خطے پنجاب میں لا بسایا۔

دوسری طرف الہلال اور البلاغ کی زور دار دعوتِ جہاد کی تائید و توثیق ہی نہیں مزید تفصیل اور توضیح کے لئے مولانا مودودی نے "الجہاد فی الاسلام" ایسی مبسوط اور معرکۃ الآراء کتاب تحریر کی جس نے ایمان کے اہم ترین رکن جہاد فی سبیل اللہ کے بارے میں مغرب کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے معذرت خواہانہ انداز کی نفی کر دی جس کا نقطۂ عروج تو غلام احمد قادیانی کا نعرۂ منسوخیٔ جہاد و قتال تھا، تاہم اس کے جراثیم اس حد تک متعدی ہو چکے تھے کہ علامہ شبلی نعمانی ایسے لوگ بھی اس سے بالکل محفوظ اور مامون نہیں رہ سکے تھے۔

مزید برآں مولانا آزاد کے اتباع ہی میں مولانا مودودی نے بھی اس حدیث نبویؐ کے مطابق جس کی جانب مولانا آزاد ہی نے ۱۹۱۲ء میں توجہ دلائی تھی "مسلمانو! میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں، اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے، یعنی التزام

جماعت کا حکم، امیر کے احکام کو سننے کا حکم، اطاعت کا حکم، ہجرت کا حکم، اور جہاد کا حکم!" (مشکوٰۃ المصابیح بحوالۂ مسند احمدؒ و جامع ترمذیؒ عن الحارث الاشعریؓ)
مسلمانوں کو خالص غلبۂ دین اور حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی جدوجہد کے لئے ایک منظم جماعت قائم کرنے کی دعوت دی۔ اس سلسلے میں جو زوردار مضامین انہوں نے لکھے اور جنہوں نے بعد میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے حصۂ سوم کی صورت اختیار کی، ان کا نقطۂ عروج "ایک صالح جماعت کے قیام کی ضرورت" نامی مضمون تھا جس کی اساس پر اگست ۱۹۴۱ء میں "جماعتِ اسلامی" قائم ہوگئی، جو گویا مولانا آزاد کی "حزب اللہ" کا معنوی تسلسل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے متعدد حضرات اس میں شامل ہوگئے جنہوں نے پہلے مولانا آزاد سے بیعت کر کے حزب اللہ میں شمولیت اختیار کی تھی، جیسے مستری محمد صدیق، ملک نصراللہ خان عزیز، اور شیخ قمرالدین وغیرہ۔

مولانا مودودی کے اس "احیائی فکر" میں جماعتِ اسلامی کے قیام کے بعد خالص قرآنی اور دینی اصطلاحات کی پیوند کاری مولانا امین احسن اصلاحی کے ذریعے ہوئی جس کے زیرِ اثر ایک جانب نصب العین کے ضمن میں "حکومتِ الٰہیہ" کی غیر قرآنی اصطلاح کی بجائے "اقامتِ دین" اور "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کی خالص دینی اصطلاحات کا رواج ہوا۔ اور مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری کے ضمن میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی اس قرآنی اصطلاح پر جس کو مولانا آزاد نے اپنی دعوت کی اساس بنایا تھا "شہادت علی الناس" کی گہری فلسفیانہ قرآنی اصطلاح کا اضافہ ہوا۔

اسی طرح امت کی اصلاح اور قیام نظامِ خلافت کے طریقِ کار کے ضمن میں مولانا آزاد نے جس قولِ امام مالکؒ یا اثرِ صدیق اکبرؓ کا حوالہ دیا تھا گویا اس کی وضاحت کے سلسلے میں مولانا مودودی کا سب سے زیادہ معرکۃ الآراء خطبہ وہ ہے جو انہوں نے ۱۹۴۱ء ہی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سٹریچی ہال میں "اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے؟" کے موضوع پر دیا۔ اور جس کا ترجمہ مولانا مسعود عالم ندویؒ

نے عربی زبان میں "منہاج الانقلاب الاسلامی" کے عنوان سے کیا۔ اس میں مولانا نے اسلامی ریاست یا حکومت کے قیام کی سعی یا بالفاظِ دیگر اسلامی انقلاب کی جدوجہد کی جملہ شرائط اور لوازم کا بیان نہایت وضاحت اور جامعیت کے ساتھ کیا اور ثابت کیا کہ ایک خالص قومی طرز کی جدوجہد کے نتیجے میں مسلمانوں کی ایک قومی ریاست تو وجود میں آسکتی ہے اسلامی ریاست یا حکومت قائم نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ یہیں سے جماعتِ اسلامی کا راستہ مسلم لیگ سے علیحدہ ہوگیا۔ اور اگر بات صرف اسی حد تک رہتی تو کوئی حرج نہ ہوتا لیکن بعد میں، جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے، اس اختلاف میں شدت بھی پیدا ہوتی چلی گئی اور تلخی کا زہر بھی گھلتا چلا گیا۔

بایں ہمہ راقم کے نزدیک مولانا مودودی کا یہ پورا علمی اور قلمی جہاد، اور دعوت و تنظیم کی جملہ مساعیٔ فکر اقبال ہی کی تعمیل کے مرحلۂ ثانی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ البتہ جیسے کہ ہم ان ہی کالموں میں کچھ عرصہ قبل تفصیل سے عرض کر چکے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کے اختتام کے بعد اب اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا عمل لامحالہ کچھ نامکمل یا ناقص داعیوں ہی کی مساعی کے ذریعے سورۃ الانشقاق کی آیت ۱۹ کے مطابق "درجہ بدرجہ" آگے بڑھے گا۔ اور ہر عبوری داعی اور قائد میں عزم و ہمت اور استقلال و استقامت کی کمی پر مستزاد فکر و فہم کی کوتاہی بھی عین قرینِ قیاس ہے جس کا نتیجہ لامحالہ وقتی ناکامی ہی کی صورت میں نکلے گا، اگرچہ اس طرح تجدید و احیاء کا عمل بحیثیت مجموعی درجہ بدرجہ اور رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہے گا۔ چنانچہ یہی معاملہ ہے جو مولانا آزاد کی طرح مولانا مودودی کے ساتھ بھی پیش آیا۔

اس سلسلے میں داعیٔ اول یعنی مولانا آزاد کا معاملہ تو سادہ بھی تھا اور بسیط بھی۔ اس لئے کہ ان کی اصل حیثیت ایک پرجوش، بلند آواز، اور خوش الحان "مؤذن" کی تھی جس کی پکار پر نمازی جمع ہوئے ہی تھے کہ منتشر کردئے گئے۔ پھر ان کی کوئی خاص

تصانیف بھی نہیں تھیں' صرف کچھ خطبات تھے اور کچھ صحافتی مقالات (واضح رہے کہ "ترجمان القرآن" بہت بعد کی چیز ہے۔) مزید برآں انہوں نے پسپائی بھی اختیار کی تو علی الاعلان (جس کے ضمن میں انہوں نے تو "وقت کی عدم مساعدت اور استعداد" کو موردِ الزام ٹھہرایا لیکن ان کے بعض ساتھیوں اور بیعت کرنے والوں' مثلاً مولانا محمد علی قصوری' نے ان پر "بزدلی" تک کا الزام لگایا۔) چنانچہ حزب اللہ اور دار الارشاد دونوں کی بساط انہوں نے اس طرح لپیٹی کہ پھر ان کا نام بھی کبھی نہیں لیا اور اپنے آپ کو ہمہ تن حصولِ آزادی کی جدوجہد (یا زیادہ سے زیادہ قرآن حکیم کے ساتھ ذاتی علمی شغل) کے لئے وقف کردیا ـــــ لیکن داعئ ثانی یعنی مولانا مودودی کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ ان کی قائم کردہ جماعت اپنے اصل ابتدائی نام لیکن علیحدہ علیحدہ نظاموں کے ساتھ سابق ہندوستان کے جملہ خطوں یعنی پاکستان' بھارت' بنگلہ دیش اور کشمیر میں موجود اور بر سرِ کار ہے۔ اور پورے عالمِ اسلام میں اسی کو برِّعظیم ہندو پاک کی اصل اور واحد اسلامی تحریک کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے اور غیر مسلم ممالک میں بھی اسے ایک قابل لحاظ بنیاد پرست قوت سمجھا جاتا ہے ـــــ بایں ہمہ اگر نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ تاحال کہیں کامیابی کی منزل کے آس پاس بھی نظر نہیں آتی تو اس کے اسباب میں جہاں خارجی اور ثانوی عوامل بھی شامل ہیں' وہاں داخلی طور پر خود داعی کے فکر کی چند بنیادی تقصیرات بھی ہیں جن کی وضاحت اس جدوجہد کے آئندہ تسلسل کے لازمی تقاضے کی حیثیت سے ضروری اور لابدی ہے اور اللہ گواہ ہے کہ اس سے نہ ان کی توہین مقصود ہے نہ تنقیص۔

اس فکر کی اہم ترین اور سب سے بنیادی کمی ایمانی حقائق کے ادراک و شعور اور اس "باطنی تجربے" کی ضرورت و اہمیت سے خطرناک حد تک بے اعتنائی ہے جسے علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں تو نہایت جوش و خروش اور کیف و سرور کے

ساتھ بیان کیا ہی ہے' "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیلِ جدید" کے پہلے تین خطبات کا موضوع بھی بنایا ہے۔ اس بے اعتنائی نے اس تحریک میں روحانیت کا عنصر ابتداء ہی سے خطرناک حد تک کم کردیا تھا۔ اور بالآخر اسے ایک خالص سیاسی تحریک بنا کر رکھ دیا۔ اس موضوع پر ایک مفصل بحث راقم الحروف نے اب سے چھبیس برس قبل اپنی ایک تحریر "اسلام کی نشأۃ ثانیہ کرنے کا اصل کام" میں کی تھی۔

دوسری اہم تقصیر مولانا مودودی کے عمرانی فکر کی ہے کہ جہاں نقدی کے سود کی حرمت کو تو انہوں نے خود بھی خوب سمجھا اور بیان بھی خوب کیا' وہاں زمین کے سود' یعنی غیر حاضر زمینداری اور جاگیرداری کی نفی سے وہ یکسر قاصر ہی نہیں رہے' ان کی تائید اور تقویت کے لئے ایک کتاب بھی لکھ دی۔ پاکستان کی قومی سیاست کے اکھاڑے میں اترنے کے بعد تو یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ یہ معاملہ حکمتِ عملی اور مصلحت اندیشی کی بنا پر ہوا ہو' لیکن حیران کن امر یہ ہے کہ فکرِ اقبال کا یہ گوشہ مولانا کی نگاہ سے ابتداءً کیسے اوجھل رہ گیا۔ شاید اس میں اصل عمل دخل حیدر آباد دکن کے ریاستی اور جاگیردارانہ ماحول کا ہو جس میں مولانا نے نشو و نما پائی تھی' واللہ اعلم' لیکن بہرحال اس تسامح یا تقصیر نے پاکستان میں اقامتِ دین کی تحریک کو انقلابی جذبے سے یکسر محروم کردیا۔

تیسرا معاملہ جس کے ضمن میں مولانا مودودی سے تقصیر ہوئی جماعتِ اسلامی کے لئے تنظیمی ڈھانچے کا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ دورِ نبوت سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک امتِ مسلمہ میں "تنظیم" کی واحد اساس "بیعت" رہی۔ چنانچہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر صحابہؓ سے بیعتیں لیں جن میں سے بیعت عقبۂ ثانیہ تو آپؐ کے پیغمبرانہ مشن کی تکمیل کے ضمن میں فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ پھر خلافت کا نظام قائم ہوا تو وہ بھی بیعت کی اساس پر تھا۔ خلافتِ راشدہ کے خاتمے کے بعد اصلاحِ حکومت کے لئے جتنی کوششیں ہوئیں (جس کی اس وقت واحد ممکن العمل صورت "خروج" ہی کی تھی) تو وہ سب بھی بیعت

کی اساس پر ہوئیں۔ پھر جب ع "ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی" والا معاملہ ہوگیا تو ایک جانب ملوکیت کا نظام بھی بیعت کی اساس پر قائم ہوا اور دوسری جانب سلوک وارشاد کے سلسلے بھی بیعت ہی کی بنیاد پر قائم ہوئے۔ یہاں تک کہ گذشتہ صدی کے دوران جہاد کی جتنی تحریکیں پورے عالم اسلام میں برپا ہوئیں، خواہ وہ ہندوستان کی تحریکِ مجاہدین تھی، خواہ لیبیا کی سنوسیؒ تحریک، اور خواہ مہدی سوڈانیؒ کی تحریک، سب بیعت ہی کی اساس پر منظم ہوئیں۔ اور یہ سلسلہ موجودہ صدی کے آغاز تک قائم رہا۔ چنانچہ مولانا مودودی کے حوالے سے تو اہم ترین معاملہ مولانا آزاد کی "حزب اللہ" کا ہے جس کی تاسیس بیعت ہی کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ (بعد کی ایک اور مثال یہ ہے کہ جب علماءِ اسلام نے قادیانیت کے سدِباب کے لئے تحریک چلانے کا فیصلہ کیا تو اس کے لئے بھی سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو امیرِ شریعت مقرر کر کے ان سے بیعت کی گئی۔ اور بیعت کرنے والوں میں مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ ایسے بیہقیؒ وقت بھی شامل تھے جن سے علامہ اقبال نے متعدد بار درخواست کی تھی کہ لاہور منتقل ہوجائیں تاکہ دونوں مل کر فقہ اسلامی کی تدوینِ نو کا مشکل مرحلہ طے کرسکیں، اور مولانا احمد علی لاہوریؒ بھی تھے جو طویل عرصے تک انجمن حمایتِ اسلام کے قائم کردہ "اشاعتِ اسلام کالج" کی مینجنگ کمیٹی کے صدر رہے تھے جس کے نگران علامہ اقبال اور سید غلام بھیک نیرنگ تھے۔)

چنانچہ خود مولانا مودودی کا اپنا ذہن بھی ان کے مارچ ۱۹۴۱ء کے ایک خط میں کھل کر سامنے آجاتا ہے جو انہوں نے جماعتِ اسلامی کے قیام سے صرف پانچ ماہ قبل حیدر آباد (دکن) کے مولانا محمد یونس مرحوم کے نام لکھا تھا، جسے انہوں نے اپنی تالیف "خطوط کے چراغ" میں شامل کیا ہے۔ اس میں مولانا نے بیعت کی تین قسمیں بیان کیں، یعنی: ایک وہ جو کسی خاص مرحلے پر کسی معین کام کے لئے لی جائے جیسے بیعتِ رضوان، دوسری بیعتِ سلوک و ارشاد، اور تیسری وہ بیعت "جو اسلامی جماعت کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے" جس کے ضمن میں وہ مزید وضاحت فرماتے

ہیں کہ: "اس کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام اللہ اور اس کے رسولؐ کا مطیع رہے، اس وقت تک جماعت کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے۔ من مات وَ لیسَ فی عُنقِہِ بیعۃٌ الخ (یعنی "جو مسلمان مرا اس حال میں کہ اس کی گردن میں بیعت کا حلقہ نہ تھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا" صحیح مسلم" عن عبداللہ ابن عمرؓ) اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ان سب سے مراد یہی تیسری بیعت ہے کیونکہ اس پر اسلامی جماعت کی زندگی اور اس کے نظام کا قیام منحصر ہے۔ اس سے الگ ہونے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس کام کے لئے تشریف لائے تھے اور جس امرِ عظیم کا بار آپؐ امت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے۔"

اس کے باوجود اگر مولانا مودودی نے جماعتِ اسلامی کے لئے بیعت کی اس منصوص، مسنون اور ماثور اساس کو چھوڑ کر مغرب سے درآمد شدہ تنظیمی ڈھانچہ اختیار کیا تو اس کی جو واحد وجہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب "ایک صالح جماعت کے قیام کی ضرورت" کے جواب میں کچھ نوجوان اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ ساتھ مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا امین احسن اصلاحی ایسی بھاری بھرکم مذہبی شخصیتیں بھی "من نیز حاضری شوم" کے مصداق حاضر ہو گئیں تو مولانا ان سے "بیعت" کا مطالبہ کرنے کی ہمت نہ کر سکے اور ایک نیم جمہوری اور نیم "امیری" ڈھانچہ اختیار کر لیا۔ لیکن چونکہ جماعتِ اسلامی کی امارت کے بارے میں مولانا کا اپنا ذہن وہی تھا جو اوپر درج ہوا لہٰذا ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۶ء تک مسلسل پندرہ برس عملی اعتبار سے جماعت میں امارت یا "آمریت" اور جمہوریت یا "شورائیت" کے مابین کشاکش جاری رہی جو بالآخر ۵۷۔۱۹۵۶ء میں دھماکہ خیز بحران کا سبب بن گئی، جس سے جماعت کی تحریک کو شدید نقصان پہنچا۔ اس کے برعکس اگر مولانا ۴۱ء ہی میں اپنے اس ذہن کو بروئے کار لانے کی جرأت کر لیتے جو بالآخر انہوں نے ۵۸ء میں شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو میری تالیف "تاریخ جماعتِ اسلامی کا ایک

گمشدہ باب") تو اگرچہ شروع میں ساتھ آنے والوں کی تعداد کسی قدر کم رہتی لیکن بعد میں دوام اور تسلسل برقرار رہتا۔ اور ۴۳ء اور ۵۷ء کے بحران پیدا نہ ہوتے۔ واللہ اعلم!

مولانا مودودی کے تحریکی فکر میں چوتھا "خلا" منہجِ انقلاب کے ضمن میں تھا' یعنی یہ کہ دعوت' تنظیم' تربیت اور "کشاکش خس و دریا" کے ابتدائی مراحل کے بعد جب مناسب قوت فراہم ہوجائے تو آخری "اقدام" یا انگریزی لفظ "پوش" یا "پوچ" کی عملی صورت کیا ہوگی؟ اس پر مولانا نے یا تو بالکل غور ہی نہیں کیا تھا' یا اس کے بیان کو خلافِ مصلحت سمجھا۔ اس لئے کہ "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" عام تحریر میں جس کا ذکر اس سے قبل ہوچکا ہے اسلامی انقلاب کے ان جملہ ابتدائی لوازم اور مراحل کو اپنے مخصوص طرز اور اسلوب میں بہ کمالِ حسن و خوبی بیان کرنے کے بعد' جن کا بیان راقم نے بھی اپنی بساط کے مطابق ان کالموں میں کچھ ہی عرصہ قبل "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جدوجہد کے مراحل" کے عنوان سے متعدد اقساط میں کیا ہے' مولانا مودودی نے بار بار اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے پر اکتفا کی ہے کہ "تب ایک طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خالص نظام حکومت ابھر آتا ہے جس کے لئے ان طاقتور اسباب نے جدوجہد کی ہوتی ہے" اور "آخر کار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی حکومت قائم ہوجائے گی جس کے لئے اس طرز پر زمین تیار کی گئی ہو۔" اور اس طرح گویا آخری اقدام اور اس سے پیدا ہونے والے "تصادم" کے ذکر سے گریز کیا ہے۔ گویا علامہ اقبال نے منہجِ انقلابِ اسلامی کو اپنے جس معجز نما شعر میں بہ تمام و کمال سمو دیا تھا اس کے مصرعۂ اول یعنی ۔ "بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن!" کے جملہ تقاضے تو مولانا مودودی نے خوب سمجھے بھی اور سمجھائے بھی' لیکن مصرعۂ ثانی یعنی ۔"چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!" کے تقاضے یا تو خود ان پر بھی پوری طرح واضح نہیں تھے' یا انگریز کی حکومت کے زمانے میں معاملہ "مصلحت نیست کہ از پردہ بروں آید راز!" والا

تھا۔ راقم کے نزدیک معاملہ پہلا تھا۔ اس لئے کہ اگر یہ "خلا" صرف مصلحت کی بنا پر ہوتا تو اس سے وہ مضر ہی نہیں مہلک نتیجہ ہرگز برآمد نہ ہو سکتا جو حصولِ آزادی اور قیامِ پاکستان کے بعد ظاہر ہوا۔ یعنی میرے نزدیک یہ انقلابی اور تحریکی فکر کی اسی تقصیر کا نتیجہ تھا کہ مولانا نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد جماعتِ اسلامی کو پاکستان کی انتخابی سیاست کے میدانِ کارزار میں داخل کر کے کشاکشِ اقتدار میں ایک فریق کی حیثیت دیدی جس کے نتیجے میں اس کی "اصولی اسلامی انقلابی جماعت" کی حیثیت یکسر تبدیل ہو کر "اسلام پسند قومی سیاسی جماعت" کی صورت اختیار کر گئی، جس کے جملہ منطقی تقاضے بعد میں "ناگزیر برائی" کے طور پر اور "اَھْوَنُ الْبَلِیَّتَیْنِ" کے قدیم شرعی حیلے کے مطابق پورے کئے جاتے رہے۔ اور رفتہ رفتہ نوبت بایں جا رسید ع "کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!" اور جب اس قلبِ ماہیت کا ناگزیر نتیجہ اس صورت میں برآمد ہوا کہ جماعت کے قدیم کارکنوں کا رہا سہا انقلابی جذبہ بھی بالکل ختم ہو گیا تو انقلاب کے لئے "راست اقدام" کے تقاضوں کو فوری طور پر اور کسی قدر وسیع پیمانے پر پورا کرنے کے لئے ایک متبادل تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی، جو "پاسبان" کی صورت میں منصۂ شہود پر آچکی ہے!

راقم نے جماعتِ اسلامی کی اس "قلبِ ماہیت" پر اصولی لیکن مفصل کلام اپنے اس بیان میں کیا تھا جو ۵۶ء میں بحیثیت رکن جماعتِ اسلامی مرکزی مجلسِ شوریٰ کی مقرر کردہ "جائزہ کمیٹی" کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ (اور بعد میں "تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے طبع ہوا۔) اپنے اس بیان کے آخری باب "نتیجۂ کلام" میں راقم نے یہ لکھا تھا کہ "میں نے نہ یہ کہا ہے اور نہ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ ۴۷ء میں جب طریقِ کار تبدیل کیا گیا تو دانستہ طور پر اس تبدیلی کا ادراک کرنے کے باوجود کیا گیا جو اس طرح اس پوری تحریک کی بنیادی نوعیت میں برپا ہو رہی تھی، لیکن یہ بہرحال میں سمجھتا ہوں ------ کہ طریقِ کار کی اس تبدیلی نے جماعت کو سطحی طور پر متاثر نہیں کیا بلکہ اس کو جڑوں سے لے کر شاخوں تک اور سر

سے لے کر پیر تک بدل کر رکھ دیا ہے اور اب اس جماعت کی بنیادی نوعیت تک میں فرق واقع ہو چکا ہے"۔

اور پھر "تبدیلی کیوں؟" کے ذیل میں "اس کی وجہ" یہ معین کی تھی کہ "میں اگر ایک لفظ میں اس اصل وجہ کو بیان کرنا چاہوں تو وہ ایک لفظ 'عجلت پسندی' ہے ....." مزید برآں سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۷ اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۱ کے حوالے سے عرض کیا تھا کہ یہ کمزوری "انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور انسان کا خمیر جس مٹی سے اٹھا ہے اس میں جزو لاینفک کے طور پر شامل ہے" لیکن اس وقت جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کا ایک اہم سبب فکر کا متذکرہ بالا "خلا" بھی تھا۔ یعنی چونکہ انقلابی جدوجہد کے آخری "اقدام" کے ضمن میں ذہن میں واضح نقشہ پہلے سے موجود نہیں تھا لہٰذا آزادی کے فوراً بعد پاکستان کی قومی سیاست کے میدان میں طاقت کا جو ظاہری خلا نظر آیا اس نے کشاں کشاں اپنے "دامِ ہمرنگِ زمیں" کی جانب کھینچ لیا! اور عجلت پسندی کے باعث یہ عظیم حقیقت ذہن سے اوجھل رہ گئی کہ انتخابات کسی نظام کو چلانے کے لئے منعقد کئے جاتے ہیں بدلنے کے لئے نہیں' اور نظام کی تبدیلی صرف "تصادم" ہی کے ذریعے ممکن ہے!

الغرض' مولانا مودودی علامہ اقبال اور مولانا آزاد دونوں کے فکر و عمل کے جامع ہونے کے اعتبار سے تو بلاشبہ "مجمع البحرین" تھے' لیکن بدقسمتی سے تین معاملات میں تو وہ حضرت علامہ کے فکر سے پیچھے رہ گئے یعنی ایک ایمانی کیفیات اور باطنی تجربہ کی اہمیت کے شعور و ادراک کے معاملے میں' دوسرے غیر حاضر زمینداری اور جاگیرداری کی حرمت کے بارے میں' اور تیسرے انقلابی عمل کے آخری مرحلے یعنی اقدام اور تصادم کے بارے میں---- اور ایک معاملے میں وہ مولانا آزاد سے بھی پیچھے رہ گئے یعنی اسلامی انقلابی جماعت کے تنظیمی ڈھانچے کو بیعت کی منصوص' مسنون اور ماثور اساس پر استوار کرنے کی ہمت نہ کر پائے۔

بہرحال اسلام کے انقلابی فکر کی اس کامل تجدید کے بعد، جو اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبال کے ذریعے نصف صدی سے زیادہ عرصہ قبل کرادی تھی، جس کے زیرِ اثر "ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے!" کے مصداق ایران میں انقلاب برپا ہوگیا اور پسرِ اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال کی روایت کے مطابق وسطِ ایشیا کی مسلمان ریاستیں بھی "ماڈل" کی تلاش میں ہیں، اگر خود اقبال کے خوابوں کی سرزمین پاکستان میں "گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!" کے مصداق تاحال اسلامی انقلاب کی منزل تک رسائی حاصل نہیں کی جاسکی تو اس کا اصل سبب ؎

"بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است!"

اور ؎

"خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید!"

کے بموجب "منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے صحیح فہم و شعور میں کمی یا موجود الوقت تصورات اور رجحانات کے دباؤ کے باعث اس کو پوری طرح اختیار کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔

تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس عرصے کے دوران جو مساعی ہوئیں وہ بالکل رائیگاں گئیں۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ احیائے اسلام اور تجدیدِ دین کا قافلہ رفتہ رفتہ اور درجہ بدرجہ آگے بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ اب یہ حقیقت بحمداللہ پوری طرح آشکار اور واشگاف ہوچکی ہے کہ اسلام صرف مذہب نہیں کامل دین ہے جو عدلِ اجتماعی کا بہترین، جامع ترین اور متوازن ترین نظام پیش کرتا ہے۔ پھر لاکھوں انسانوں کے دلوں میں اس نظام کے برپا کرنے کا ولولہ بھی پیدا ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس پوری صدی کے دوران ع "چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ!" والی صورت عملاً برقرار رہی اور امت کے معتدبہ افراد نے ہر داعی کی آواز پر لبیک کہی

(باقی صفحہ ۸۰ پر)

دین میں 'سمع و طاعت' کا مقام

بسلسلۂ "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" کا مفہوم (۳)

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے درس قرآن سے ماخوذ

مرتب: حافظ خالد محمود خضر

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (آیت ۱۶)

"پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنی امکانی حد تک' اور سنو اور اطاعت کرو' اور خرچ کرو اپنے بھلے کے لئے۔ اور جو کوئی بچا دیا گیا اپنے جی کے لالچ سے تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

سورۃ التغابن کے دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات (۱۱۔ ۱۵) کے بارے میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ ان میں ثمراتِ ایمانی کا بیان آیا ہے' جن میں سے چار آیات کا تعلق فکر و نظر کی تبدیلی سے' جبکہ صرف ایک آیت عمل سے متعلق ہے' جس پر ہم نے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد آیت ۱۶ سے زوردار دعوتِ عمل دی جا رہی ہے۔ صرف ایک لفظ "فَاتَّقُوا اللّٰهَ" میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرہ دونوں کو سمو لیا گیا ہے اور اس کے بعد سارا زور دعوتِ عمل اور اس میں بھی خاص طور پر اطاعت پر ہے۔ چنانچہ اس کے ضمن میں فرمایا گیا: وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا (سنو اور اطاعت کرو!) اطاعت کے ضمن میں اگرچہ اس سے پہلے پوری ایک آیت گذر چکی ہے' جس پر ہم تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں' لیکن اس آیۂ مبارکہ میں بھی "وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا" کے الفاظ میں اطاعت کی زوردار دعوت ہے۔ ان الفاظ کے حوالے سے چار باتیں ذہن نشین کرنے کے قابل ہیں:

قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح

پہلی بات یہ کہ "سمع و طاعت" قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ چنانچہ قرآن

حکیم میں آیت زیر درس کے علاوہ چار مقامات پر یہ جوڑا اسی طرح آیا ہے:

۱) سورۃ البقرہ کی آخری دو آیات کے بارے میں روایت ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج میں عطا ہوئی ہیں۔ سورۃ البقرہ اگرچہ پوری کی پوری مدنی سورت ہے' لیکن اس کی آخری دو آیات اس اعتبار سے مکی شمار ہوں گی کہ واقعۂ معراج مکی دور میں پیش آیا جس کے دوران امت کے لئے تحفے کے طور پر یہ دو آیتیں دی گئیں۔ ان میں سے پہلی آیت (آیت ۲۸۵) جس کا آغاز اٰمَنَ الرَّسُوْلُ کے الفاظ سے ہوتا ہے' کے آخری الفاظ ہیں:

وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ○

"اور وہ کہہ اٹھے کہ ہم نے سنا اور ہم نے تسلیم کیا' ہم تیری مغفرت چاہتے ہیں اے ہمارے رب' اور تیری ہی طرف ہمیں لوٹنا ہے۔"

سورۃ البقرہ کے بارے میں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ شریعتِ اسلامی کا نقطۂ آغاز ہے۔

۲) شریعتِ اسلامی کا نقطۂ تکمیل یا نقطۂ عروج سورۃ المائدہ ہے۔ اس کی آیت ۷ میں فرمایا گیا:

وَاذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَمِیْثَاقَہُ الَّذِیْ وَاثَقَکُمْ بِہٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا

"اور یاد رکھنا اللہ کی نعمت کو جو (شریعت کے حوالے سے) تم پر ہوئی ہے اور اس کا عہد (بھی یاد رکھنا) جس میں اللہ نے تم کو باندھ لیا ہے جبکہ تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی!"

۳) سورۃ النور کی آیت ۵۱ میں فرمایا گیا:

اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَہُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا

"یقیناً ایمان والوں کی بات تو یہی ہے کہ جب بلایا جائے ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ وہ فیصلہ کرے ان کے مابین تو کہیں کہ ہم نے سن لیا اور حکم مان لیا۔"

۴) اسی طرح سورۃ النساء کی آیت ۴۶ میں یہود کے طرزِ عمل کا ذکر کرنے کے بعد

فرمایا:

وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ....

"اور اگر وہ کہتے کہ ہم نے سنا اور مانا اور (اے نبیؐ) سنئے اور ہم پر نظر کیجئے تو یہ ان کے حق میں بہتر اور درست ہوتا....."

تو یہ چار مقامات ہیں جہاں "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا" کے الفاظ ایک جوڑے کی شکل میں آئے ہیں۔

اب ذرا اس کا منفی پہلو بھی ملاحظہ کر لیجئے۔ کفار کی ایک روش تو یہ تھی کہ سننے ہی سے انکاری تھے' جیسا کہ سورہ لحم السجدہ کی آیت ۲۶ میں الفاظ آئے ہیں:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ○

"اور کافر (ایک دوسرے سے) کہنے لگے کہ اس قرآن کو مت سنو اور (جب محمدؐ اسے پڑھ کر سنا رہے ہوں تو) اس میں شور وغل کرو' شاید کہ (اس تدبیر سے) تم غالب ہو جاؤ!"

اِس صورت میں تو "سمع" ہی کی نفی ہو گئی' جبکہ ایک طرزِ عمل وہ تھا جو یہود نے اختیار کر رکھا تھا اور جس کا ذکر قرآن حکیم میں دوبار "سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا" کے الفاظ میں آیا ہے' یعنی "ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی"۔ یہود کے یہ الفاظ سورۃ البقرہ کی آیت ۹۳ میں بھی نقل ہوئے ہیں اور سورۃ النساء کی آیت ۴۶ میں بھی۔ مؤخر الذکر آیت کا دوسرا ٹکڑا اوپر بیان ہوا ہے۔ آیت کے پہلے حصے میں یہود کا طرزِ عمل بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ آئے ہیں کہ یہ کہتے ہیں "سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا" حالانکہ انہیں کہنا چاہئے تھا "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا"۔ تو "سمع و طاعت" درحقیقت قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح ہے۔

"سمع و طاعت" کا ایک اہم تقاضا — فوری تعمیل

دوسری بات یہ نوٹ کیجئے کہ اس اصطلاح اور اس اسلوب سے پیشِ نظر کیا ہے! "وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا" (سنو اور اطاعت کرو!) کے الفاظ میں درحقیقت فوری (immediate) اطاعت کا حکم ہے' یعنی سنتے ہی اطاعت کا لازم ہو جانا۔ ایک درمیانی طرزِ عمل یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی بات سن تو لی جائے' لیکن اگر اپنی سمجھ میں آئے تو مان لی جائے ورنہ رد کر دی جائے' اس طرح "سننے" اور "ماننے" کے درمیان "اپنی سمجھ"

حائل ہوجاتی ہے۔ اس طرزِ عمل کا تجزیہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گویا آپ اس حکم کو نہیں مان رہے بلکہ اپنی سمجھ کی اطاعت کررہے ہیں، کیونکہ آپ نے اس حکم کو مانا ہے جو آپ کی سمجھ میں آگیا۔ گویا اصل مطاع تو آپ کی سمجھ ہوئی۔ یہ اسی طرح کا طرزِ عمل ہے جیسا یہ کہ اگر اللہ کا کوئی حکم آپ کے نفس کو بھی پسند آیا اور آپ اس پر عمل پیرا ہوگئے تو آپ نے اطاعت، اللہ کی نہیں بلکہ اپنے نفس کی کی ہے۔

اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت تو بلااستثناء ہونی چاہئے، خواہ سمجھ میں آئے خواہ نہ آئے۔ تو "وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا" ایک ایسا اسلوب ہے جس میں فی الفور اطاعت کا تقاضا ہے، یعنی سنتے ہی اس پر عمل کرو۔ اپنی سمجھ میں آنے یا نہ آنے کا سوال ہی درمیان سے نکل جانا چاہئے۔ میٹرک کے زمانے میں ہم نے ایک نظم "Charge of the Light Brigade" پڑھی تھی۔ اس میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ چھ سو سواروں پر مشتمل فوج کے رسالے کو حملہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اب ان میں سے ہر شخص کو معلوم تھا کہ کسی نے غلط حکم دیا ہے

Someone has blundered

کیونکہ صورتحال اس طرح کی تھی کہ ان کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے توپیں لگی ہوئی تھیں

Cannon to right of them

Cannon to left of them

Cannon in front of them

Cannon behind them

اور حملے کی صورت میں ان چھ سو سواروں کی ہلاکت یقینی تھی ـــــ لیکن

Theres not to reason why?

Theres but to do and die!

ان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اس وقت اس حکم کی حکمت دریافت کریں اور اپنے دلائل پیش کریں کہ یہ حکم غلط دیا گیا ہے، بلکہ آرمی ڈسپلن اس طرزِ عمل کا نام ہے کہ جو حکم دیا گیا ہے اس کی فوری تعمیل کرو اور اس میں موت آتی ہے تو آئے! تو یہ ہے درحقیقت وہ

انداز جو کہ "وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا" کے جواب میں مطلوب ہے۔

سمع' طاعت پر مقدم کیوں؟

اس سلسلے میں تیسری لائقِ توجہ بات یہ ہے کہ "سمع وطاعت" میں "سمع" مقدم ہے "طاعت" پر۔ ویسے تو طبعی ضابطہ بھی یہی ہے کہ آپ کوئی بات سنیں گے تو اس کی اطاعت کریں گے' لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ "سمع وطاعت" کا حکم دیتے ہوئے "وَاسْمَعُوْا" کو کیوں نمایاں کیا گیا ہے؟ اس لئے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد ایک اجتماعی شکل اور جماعتی ہیئت ہی میں ممکن ہے اور اس سلسلے کے تمام احکام سے بروقت آگاہی کے لئے اس جماعتی نظم سے وابستگی اور پیوستگی ضروری ہے۔ اگر آپ اس جماعتی نظم سے وابستہ نہیں ہیں تو "سمع" ہی نہیں ہوگا' نتیجۃً "طاعت" کی نوبت کہاں آئے گی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام خطباتِ جمعہ میں صادر ہوتے تھے۔ اُس وقت آج کی طرح ریڈیو' ٹیلیویژن' اخبارات' ٹیلی فون اور ٹیلی گرام جیسے رَسل و رسائل اور ابلاغ کے ذرائع تو تھے نہیں۔ اب جو شخص جمعہ میں آتا ہی نہ ہو اور اس طرح ان احکام کو سننے ہی سے محروم رہے تو وہ اطاعت کیسے کرے گا! چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ جمعہ کے دوران منبر پر یہ فرمایا کہ یہ لوگ جو جمعہ میں شرکت سے رہ جاتے ہیں وہ اس طرزِ عمل سے باز آجائیں' ورنہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ اللہ ان کے دلوں پر مہر کر دے گا۔ یعنی "خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ" کے الفاظ میں بدترین کافروں کے لئے جو سزا سنائی گئی ہے انہیں وہ سزا ملے گی۔

اسی طریقے سے کوئی انقلابی جماعت جو اسی مقصد (غلبۂ دین) کے حصول کے لئے کوشاں ہے اگر آپ اس سے پیوست نہیں ہیں' اس سے چمٹے ہوئے نہیں ہیں' اس کے نظم کے ساتھ آپ کی وابستگی ہی نہیں ہے تو انقلابی جدوجہد سے متعلق احکام و ہدایات آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی ہرکارے اور پیادے احکام لئے لئے پھر رہے ہوں اور ایک ایک شخص کو تلاش کر کے ان کی تعمیل کرائیں۔ عدالتی نظام میں اور حکومتی سطح پر تو ایسا ہوتا ہے کہ گھروں پر جا کر سمن کی تعمیل کرائی جاتی ہے لیکن کسی انقلابی جماعتی نظام میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس کے لئے تو ع "پیوستہ رہ شجر

سے امیدِ بہار رکھ" کے مصداق جماعت سے وابستہ رہنا ضروری ہے۔ ایک پتہ جب تک درخت پر لگا ہوا ہے اسی وقت تک وہ اس درخت کا حصہ ہے۔ درخت کی جڑ سے لے کر اس کی چوٹی کے پتوں تک کے مابین ایک رابطہ قائم ہے۔ جڑ کے ذریعے سے جو پانی اور غذا درخت حاصل کرتا ہے وہ اس کے آخری پتے تک بھی پہنچ جاتی ہے' لیکن جب کوئی پتہ درخت سے کٹ جاتا ہے تو اب درخت کی غذا سے اسے کوئی حصہ نہیں ملتا اور اس کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ اسی طرح اگر جماعت سے آپ کا تعلق منقطع ہوگیا تو ظاہر بات ہے کہ اب آپ اس کے نظم اور سلک میں نہیں ہیں' بلکہ ایک ایسی پتنگ ہیں جس کی ڈور کٹ چکی ہے اور ایک ایسا پتہ ہیں جو اپنے درخت سے علیحدہ ہو چکا ہے۔ اسی کو پیوستگی کہا جاتا ہے اور اسی کے لئے الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں منسلک ہونا' یعنی پرویا جانا۔ ہار میں اگر موتی پروئے گئے ہیں تو وہ ہار ہے' اور اگر اس کی ڈور ٹوٹ گئی ہے تو وہ ہار نہیں رہا بلکہ منتشر موتی ہیں۔ اسی طرح جماعت کے افراد اگر اس کے ساتھ منسلک اور ملتزم ہیں تو وہ صحیح معنوں میں جماعت ہے۔ التزام کے معنی چمٹ جانا ہیں اور ملتزم وہ ہے جو جماعت کے ساتھ چمٹا رہے۔ یہی درحقیقت سمع کو مقدم رکھنے کا سبب ہے' ورنہ اس کو نمایاں کرنے کی ضرورت نہ تھی' کیونکہ یہ بات تو بالکل ظاہر اور understood ہے کہ اطاعت کا مرحلہ آتا ہی سننے کے بعد ہے۔

سمع وطاعت کا لازمی تقاضا ـــ بیعت

چوتھی اور آخری بات یہ کہ اس سمع وطاعت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کی شکل دی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ رسول تھے اور جو کوئی بھی آپؐ پر ایمان لے آتا اس پر' ایمان بالرسالت کے لازمی تقاضے کے طور پر' آپؐ کی اطاعت فرض تھی۔ اس کے باوجود نظمِ جماعت میں اس سمع و طاعت کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے باقاعدہ بیعت لی۔ اس سلسلہ میں دو حدیثیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ عَنِ الحارثِ الاشعریّ رضی اللہ عنہ قال قال رَسولُ اللّٰہِ صلّی اللہ علیہ وسلّم:

اُمُرُکُم بخمسٍ: بِالجماعۃِ' وَالسَّمعِ' وَالطَّاعۃِ' والھجرۃِ' وَالجھادِ فی سبیل اللّٰہِ

(مشکوٰۃ المصابیح' بحوالہ مسند احمد وجامع الترمذی)

حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"(مسلمانو) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دے رہا ہوں: جماعت کا حکم' سننے کا حکم' اطاعت کا حکم' ہجرت کا حکم اور اللہ کی راہ میں جہاد کا حکم!"

اس حدیث میں حضورؐ نے سب سے پہلا حکم التزامِ جماعت کا دیا ہے۔ جماعتی نظم کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یعنی اگر تو اسلامی نظامِ حکومت قائم ہو تو خلیفۃ المسلمین کے ساتھ سمع وطاعت کا تعلق ہوگا۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس نظامِ حکومت کو قائم کرنے کی جدوجہد کے لئے جو جماعتی نظام قائم ہوگا اس کے امیر کے ساتھ وہی تعلقِ سمع وطاعت ہوگا۔ اس کے بعد دوسرا حکم سمع یعنی سننے کا اور تیسرا اطاعت کا دیا گیا۔ چوتھی اور پانچویں چیزیں ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ ہیں۔ ہجرت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: **اَیُّ الھجرۃِ اَفضلُ یَارسولَ اللّٰہِ؟** "اے اللہ کے رسولؐ" سب سے افضل ہجرت کونسی ہے؟" فرمایا: **اَنْ تَھجُرَ مَاکَرِہَ رَبُّکَ** "کہ تم ہر اس چیز کو چھوڑ دو جو تمہارے رب کو پسند نہیں ہے!" یہ ہے ہجرت ـــــ اور نیت یہ رہے کہ اگر اللہ کے دین کا تقاضا ہو تو انسان اپنا گھربار' اہل و عیال اور مال و منال سب کچھ اس کی خاطر چھوڑنے کے لئے تیار ہو جائے۔ لیکن پہلا قدم یہی ہے کہ جو چیز اللہ کو پسند نہیں ہے' جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے' اس کو چھوڑ دیا جائے' اس سے ترکِ تعلق کر لیا جائے۔ اسی طرح "**وَنَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ یَفْجُرُکَ**" کے مصداق ترکِ تعلق کی یہ قینچی علائقِ دنیوی میں بھی چل جانی چاہئے کہ فُسّاق و فجار کے ساتھ آپ کی دوستی اور محبتِ قلبی کا تعلق منقطع ہو جائے ـــــ اور جہاد فی سبیل اللہ اس کا مثبت پہلو ہے۔ یعنی اللہ کی راہ میں محنت' جدوجہد' ایثار و قربانی' انفاق اور قتال' یہ سب جہاد فی سبیل اللہ ہی کے مدارج و مراتب ہیں۔ لیکن بہرحال نیت میں یہ چیز لازمی طور پر شامل رہنی چاہئے کہ وہ وقت آئے کہ میں اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے جان کی بازی لگادوں اور اس راہ میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر کے سرخرو ہو جاؤں' میری گردن اللہ کی راہ میں کٹ جائے۔ اگر کسی کے دل میں یہ نیت بھی موجود نہیں تو حدیث نبویؐ کی رو سے ایسا شخص حالتِ نفاق میں مرتا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

مَن ماتَ وَلَم یَغزُ وَلَم یُحدِّث بِہٖ نفسُہٗ ماتَ علٰی شُعبَۃٍ مِنَ النِّفاق
(صحیح مسلم، عن ابی ہریرہؓ)
"جو شخص اس حال میں مرا کہ نہ اس نے (اللہ کی راہ میں) جنگ کی اور نہ ہی دل میں اس کی آرزو رکھی تو اس کی موت ایک طرح کے نفاق پر ہوئی۔"

ہمارے تصورِ دین کی کوتاہی

حضرت حارث اشعریؓ والی حدیث کی روشنی میں ذرا اپنے اِس وقت کے تصورِ دین کا جائزہ لیجئے تو آپ کو بہت فرق و تفاوت نظر آئے گا۔ ہمارے تصورِ دین میں تو یہ چیزیں سرے سے ہیں ہی نہیں۔ ہمارے تصورِ دین میں وہ پانچ چیزیں تو ہیں جنہیں ایک دوسری حدیث میں ارکانِ اسلام فرمایا گیا ہے، یعنی کلمۂ شہادت، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ــــ لیکن اِن پانچ چیزوں کا ہمیں کچھ پتہ ہی نہیں۔ اُس حدیث کے الفاظ ہیں:

بُنِیَ الاِسلامُ علٰی خمسٍ، شَھادَۃِ اَن لا الٰہ اِلَّا اللّٰہ وَاَنَّ محمّدًا رَسولُ اللّٰہِ وَاِقامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیتاءِ الزَّکٰوۃِ وَحَجِّ البیتِ وَصَومِ رَمَضانَ
(متفق علیہ، عن عبداللہ بن عمرؓ)
"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔"

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ ارکانِ اسلام بیان فرمائے ہیں جو ہر مسلمان کو یاد ہیں۔ لیکن دوسری پانچ چیزوں کا حکم بھی محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے دیا ہے، تو ان سے بے اعتنائی چہ معنی دارد! بلکہ ایک روایت میں الفاظ ہیں:

اِنّی اٰمُرُکُم بِخَمسٍ، اللّٰہُ اَمَرَنی بِھِنَّ ......
"میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں، اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے......"

"اَطِیعُوا اللّٰہَ وَاَطِیعُوا الرَّسُولَ" کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ان پانچ چیزوں کو بھی لازم سمجھا جائے۔

صحابہ کرامؓ کی بیعت کے الفاظ اور ان کی تشریح

اس "سمع و طاعت" کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے جو بیعت لی وہ اس حدیث میں مذکور ہے:

عَنْ عُبادَةَ بنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ قال: بَايَعْنَا رَسُولَ اللّٰہِ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم عَلَى السَّمعِ وَالطَّاعَةِ فِي العُسرِ وَاليُسرِ وَ المَنْشَطِ وَالمَكرَهِ وَعلىٰ اَثَرَةٍ علينا وَعلىٰ اَن لَا نُنَازِعَ الاَمرَ اَهلَهٗ

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے بیعت کی تھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ بَاعَ-یَبِیعُ بیچنے کو کہا جاتا ہے اور بیعت' اہلِ ایمان کی اللہ کے ساتھ بیع و شراء ہے' جیسا کہ سورۃ التوبہ میں ارشاد فرمایا گیا: **اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ** کہ اللہ نے اہلِ ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ لیکن چونکہ اللہ سامنے نہیں ہے لہٰذا یہ بیع و شراء اللہ کے رسولؐ کے ہاتھ پر ہو رہی ہے۔ اور عرب کا دستور یہ تھا کہ کوئی سودا جب مکمل ہو جاتا تھا تو مصافحہ (Hand Shake) کیا جاتا تھا۔ اور یہ مصافحہ بیعت میں بھی ہے۔ صحابہ کرامؓ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بیعت کس چیز کی تھی؟ اس کے لئے الفاظ آئے ہیں: **عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ** "اس پر کہ سنیں گے اور مانیں گے!" یہی دراصل وہ جوڑا ہے (سمع و طاعت) جس کے حوالے سے یہ ساری گفتگو ہو رہی ہے اور جس کا حکم آیۂ زیرِ درس میں ہے: **فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا**۔

اب حدیث میں اس سمع و طاعت کی تین کیفیات بیان ہوئی ہیں۔ اول یہ کہ **فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ** "چاہے تنگی ہو چاہے آسانی ہو" —— یہ نہیں کہ بس آسانی ہی کے اندر اطاعت کریں گے۔ بلکہ چاہے تنگی ہو' مشکل ہو' ہمارے لئے اپنا گزر مشکل ہوا ہو۔لیکن بہرحال جب نبیؐ کا حکم آئے گا تو بلا چون وچرا مانیں گے۔ دوم یہ کہ **وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ** چاہے ہماری طبیعت میں آمادگی ہو' نشاط ہو اور چاہے ہمیں اپنی طبیعتوں کو مجبور کرنا پڑے —— اطاعت کی بحث میں میں یہ عرض کرچکا ہوں کہ اطاعت اصلاً تو طوعِ خاطر سے اور بطیبِ خاطر ہی مطلوب ہے' لیکن جماعتی زندگی میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی محسوس کرتا ہے کہ "Someone has blundered" آپ کا یہ خیال ہو سکتا ہے کہ

میرا امیر غلطی کر رہا ہے' لیکن اگر وہ معصیت کا حکم نہیں دے رہا' اللہ اور رسولؐ کے کسی صریح حکم کے خلاف حکم نہیں دے رہا' تو اگرچہ یہ حکم آپ کی رائے کے خلاف ہو لیکن آپ کو ماننا ہوگا۔ اس میں ظاہر ہے کہ آپ کو اپنی رائے کو دبانا ہوگا' اپنے نفس کو گھوٹنا ہوگا' لیکن اطاعت بہرحال لازم ہوگی۔ سوم یہ کہ وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا "اور چاہے ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے" جماعتی نظام میں یہ مرحلہ لازماً آجاتا ہے۔ کسی شخص کے دل میں یہ خیال آسکتا ہے' جو وسوسہ بھی ہو سکتا ہے اور کسی کی واقعی رائے بھی ہو سکتی ہے' کہ میں اس منصب کا زیادہ اہل ہوں' میرے اندر ان کی صلاحیت زیادہ ہے۔ یا یہ کہ میری Standing بہت ہے' میں بہت عرصے سے جماعت کے اندر ہوں' لیکن ایک شخص جو بالکل نووارد تھا اسے امیر بنادیا گیا ہے۔ ایسے معاملات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بھی پیش آئے ہیں۔ غزوۂ موتہ کے موقع پر جب حضورؐ نے حضرت زید ابنِ حارثہ رضی اللہ عنہ کو امیر بنا دیا تو کئی لوگوں نے اعتراضات کئے اور کہا گیا کہ جعفر طیارؓ جیسے لوگ ایک آزاد کردہ غلام کی کمان میں دئے جارہے ہیں۔ حضرت جعفرؓ واقعۃً بڑے جلیل القدر صحابی تھے' حضور کے چچا زاد بھائی اور حضرت علیؓ کے بڑے بھائی تھے۔ پھر حضورؐ نے اپنے مرضِ وفات میں حضرت زیدؓ کے بیٹے حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کو امیر بنایا تو اس پر بھی اعتراضات ہوئے۔ اور اپنے مرضِ وفات کے اندر آپؐ نے بڑے غصے سے یہ الفاظ فرمائے تھے کہ اگر آج تم لوگ اسامہ کی امارت پر اعتراض کررہے ہو تو تم نے اس کے باپ کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا۔

انسانی معاملات میں یہ ساری چیزیں پیش آسکتی ہیں' پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا حضورؐ نے جب بیعت لی تو "وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا" کے الفاظ سے اہلِ بیعت کو گویا کہ باندھ لیا' کیونکہ یہ فیصلہ اور اختیار صاحبِ امر کا ہوتا ہے کہ وہ کس کے حوالے کوئی ذمہ داری کرتا ہے۔ چنانچہ بیعت میں یہ شرط بھی شامل ہوگئی کہ چاہے ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے ہم اطاعت کریں گے۔

اب جماعتی نظم میں ماتحت امراء کا ایک نظام ناگزیر ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں بھی ماتحت امراء تھے۔ آپؐ کوئی جیش بھیجتے تو اس کا کسی کو سپہ سالار مقرر فرماتے۔ پھر کسی ایک ہی لشکر میں مختلف دستوں کے مختلف امراء ہوتے تھے' میمنہ کا امیر کوئی اور' میسرہ کا

کوئی اور' قلب پر کوئی اور' اور ہراول دستے کا کوئی اور ہوتا۔ غزوۂ احد میں درے پر جو پچاس تیر انداز مقرر کئے گئے ان پر بھی ایک امیر مقرر کیا گیا۔ چنانچہ یہ بیعت بھی لی گئی کہ **وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ** یعنی جو بھی صاحبِ امر ہوں گے' ماتحت امراء ہوں گے' ان سے اہم امر کے معاملے میں جھگڑیں گے نہیں' وہ جو حکم دیں گے اسے بھی مانیں گے۔ اس میں وہ استثناء بہرحال موجود رہے گا کہ وہ معصیت کا حکم نہیں دے سکتے۔ اس بارے میں ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں کہ ماتحت امراء کا معاملہ' چاہے وہ حضورؐ کے زمانے میں تھا' اور حضورؐ کے انتقال کے بعد چاہے مسلمانوں کا کوئی خلیفہ ہو اور چاہے کسی جماعت کا امیر ہو' سب کی اطاعت اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔ ان کی اطاعت اللہ اور رسول کے احکام کے دائرے کے اندر اندر ہوگی اور یہ اس سے باہر نہیں جا سکتے۔ اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف حکم نہیں دے سکتے۔

اس حدیث میں آگے الفاظ آئے ہیں **اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ فِیْہِ مِنَ اللّٰہِ بُرْھَانٌ**۔ یہ الفاظ صحیح بخاری کی روایت میں نہیں ہیں' صرف صحیح مسلم کی روایت میں ہیں۔ پھر یہ بھی نوٹ کیجئے کہ یہاں صیغہ تبدیل ہوگیا ہے۔ اس سے پہلے تک کے الفاظ بیعت کرنے والوں کی طرف سے' جمع کے صیغے میں ہیں' لیکن اس ٹکڑے میں جمع مخاطب کا صیغہ آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان الفاظ کا اضافہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ فِیْہِ مِنَ اللّٰہِ بُرْھَانٌ** "سوائے اس کے کہ تم دیکھو کوئی کھلا کفر جس کے لئے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے دلیل موجود ہو۔" یعنی تمہیں ثابت کرنا ہوگا کہ یہ بات کتاب و سنت کے منافی ہے' یہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے یہ کفر ہے' اس لئے میں نہیں مانوں گا! جیسے کہ وہ معاملہ ہوا کہ امیر نے خودکشی کا حکم دیا کہ آگ کے گڑھے میں کود جاؤ' لیکن مامورین نے اسے ماننے سے انکار کردیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصویب فرمائی اور فرمایا کہ اگر کہیں وہ اس آگ میں کود گئے ہوتے تو کبھی اس سے نکلنا نصیب نہ ہوتا۔

اس بیعت میں آخری بات یہ ہے کہ **وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا** "اور یہ کہ ہم حق بات کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں گے"۔ حق بات کہنا اور صحیح مشورہ دینا اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔ کسی بھی ہیئتِ اجتماعی میں اس کا ایک نظام موجود ہونا ناگزیر ہے اور اس

کے بغیر کوئی جماعتی زندگی صحیح اور صالح نہیں رہ سکتی۔ امیر کا انداز تحکمانہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ اسے باہمی مشورے سے معاملات طے کرنے چاہئیں۔ چنانچہ بیعت کی بنیاد پر بننے والی تنظیم میں بھی مشورہ کا نظام لازمی ہے۔ لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ "ہم اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے"۔ یعنی کوئی شخص یہ سمجھتے ہوئے کہ میری حیثیت ہی کیا ہے اور میں کچھ کہوں گا تو لوگ اس پر ہنس پڑیں گے' خاموش رہے تو یہ بات درست نہیں ہے۔ اسے کسی سے ڈرنا نہیں چاہئے بلکہ اس کی جو رائے ہے وہ دیانتداری کے ساتھ پیش کردینی چاہئے۔ البتہ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اسلام کے نظمِ جماعت میں فیصلہ ووٹوں کی گنتی سے نہیں ہوتا ع کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید! یعنی دو سو گدھوں کے دماغوں سے ایک انسان کا ذہن وجود میں نہیں آتا! اقبال نے اس شعر میں بڑی سیدھی سی بات بیان کردی ہے۔ مصرعۂ اولیٰ ہے ع گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو! یعنی یہ جو مغرب کا تصور جمہوریت ہے کہ ووٹوں کی گنتی سے معاملات طے کئے جائیں اس سے بچو! اسلامی نظمِ جماعت میں باہمی مشورے کے بعد فیصلہ کا اختیار صاحبِ امر کو حاصل ہوتا ہے۔

بیعت کا موقع و محل

اس بیعتِ سمع و طاعت کے بارے میں ایک اہم بات یہ نوٹ کرنے کی ہے کہ حضورؐ نے یہ بیعت مکہ میں نہیں لی۔ یہ بیعت اگرچہ مکی دور ہی میں ہوئی ہے' لیکن سمجھ لیجئے کہ یہ کس مرحلے پر ہوئی ہے۔ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لانے والے تعداد میں بہت کم تھے۔ پھر چونکہ سب مسلمان ایک ہی شہر میں تھے لہٰذا سب کا واسطہ و تعلق حضورؐ کے ساتھ براہِ راست تھا۔ آپؐ کا حکم ہر ایک کو براہ راست پہنچتا تھا' یا زیادہ سے زیادہ کسی پیغام رساں کی ضرورت ہوتی تھی۔ حضرت خبابؓ بن ارت اور عمار بن یاسرؓ جیسے حضرات دارِ ارقمؓ میں حضورؐ کے پاس ہمہ وقت رہتے تھے اور جونہی کوئی وحی نازل ہوتی یہ مکہ میں صحابہ کرامؓ کے گھروں میں پہنچ کر تازہ نازل ہونے والی قرآنی آیات کی تعلیم دیتے۔ اس کے علاوہ اور کسی درمیانی نظم کی ضرورت نہیں تھی' لہٰذا کوئی ماتحت امراء نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے مکہ میں ایمان لانے والے صحابہ سے بیعت

نہیں لی۔ لیکن جب یثرب سے لوگ آپؐ کی دعوت پر ایمان لانے لگے اور ایک سال میں چھ افراد ایمان لائے' دوسرے سال وہ بارہ ہوگئے اور تیسرے سال میں جب بہتر(۷۲) افراد حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئے تب آپؐ نے ان سے مذکورہ بالا الفاظ میں بیعت لی اور ان میں سے بارہ کو ان پر نقیب مقرر کردیا۔ ہم نے تنظیمِ اسلامی کے ماتحت نظم میں نقیب کا لفظ وہیں سے لیا ہے۔ نیز قرآن مجید میں بھی مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں پر بارہ نقباء مقرر تھے' یعنی ہر قبیلے پر ایک نقیب تھا۔ نقیب کے معنی ہیں خبرگیری کرنے والا' دیکھ بھال کرنے والا' نگرانی کرنے والا۔ تو حضورؐ نے بہتر میں سے بارہ افراد کو نقیب مقرر کردیا' گویا ہر نقیب کے حوالے پانچ پانچ مسلمانوں کو کردیا کہ وہ ان کے حالات کی خبرگیری کرے' ان کی نگرانی اور رہنمائی کرے۔ اب ظاہر بات ہے کہ ان بہتّر افراد کا حضورؐ سے براہ راست رابطہ نہیں تھا۔ وہ تو اگلے سال حج ہی کے موقع پر آئیں گے تو ملاقات ہوگی' تو گویا کہ درحقیقت یہ بیعت ایک ایسے نظمِ جماعت میں لی گئی جس میں کچھ درمیانی امراء اور عہدیدار بھی ہوں اور ہر صاحبِ ایمان کا براہِ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رابطہ نہ ہو۔ چنانچہ ہم نے بھی اسی حدیث کو تنظیمِ اسلامی کے لئے بیعت کی بنیاد بنایا ہے۔ اور میرا یہ دعویٰ ہے کہ نظمِ جماعت کے لئے صرف اس ایک حدیث کے اندر مکمل دستور موجود ہے۔ ہم نے اگرچہ تشریح و توضیح کے لئے اس کا ایک تنظیمی ڈھانچہ بھی بنایا ہے' اس کے قواعد و ضوابط بھی طے کئے ہیں اور نظام العمل بھی ترتیب دیا ہے' لیکن اس سب کا دارومدار درحقیقت اسی پر ہے۔ اسی حدیث سے استنباط اور استدلال کرتے ہوئے ہم نے اپنا جماعتی نظام تشکیل دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے کہ "وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِیْعُوْا" اور "اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ بِالْجَمَاعَۃِ وَ السَّمْعِ وَ الطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَ الْجِھَادِ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ" اور پھر اس سمع و طاعت کے لئے یہ مسنون بیعتِ سمع و طاعت' جو متفق علیہ احادیث سے ثابت ہے' ہم ان سب تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ آمین!!

بَارَکَ اللّٰہُ لِیْ وَلَکُمْ فِی الْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ وَ نَفَعَنِیْ وَ اِیَّاکُمْ بِالْاٰیَاتِ وَ الذِّکْرِ الْحَکِیْمِ ○○

گیارہواں کبیرہ

بیت اللہ کی حرمت پامال کرنا

مؤلف: ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

رُوئے زمین پر سب سے پہلا "خانۂ خدا" بیت اللہ المحترم کس قدر ادب، احترام، عظمت اور تقدس والا ہے اور اسی بیت اللہ کی نسبت سے مکہ مکرمہ کس قدر عزت و شرف والا ہے، اس کا اندازہ اُن احکام و آداب سے ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِنَّ هٰذَا الْبَلَدَ حَرَّمَهُ اللهُ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فَهُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَةِ اللهِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَاِنَّهُ لَمْ يَحِلَّ الْقِتَالُ فِيْهِ لِاَحَدٍ قَبْلِيْ وَلَمْ يَحِلَّ لِيْ اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَهَارٍ، فَهُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَةِ اللهِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، لَا يُعْضَدُ شَوْكُهُ وَلَا يُنَفَّرُ صَيْدُهُ وَلَا يَلْتَقِطُ اِلَّا مَنْ عَرَّفَهَا وَلَا يُخْتَلٰى خَلَاهُ[1]

"جس روز اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اسی روز سے اس شہر مکہ کو حرمت والا قرار دیا، لہٰذا قیامت تک اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی وجہ سے وہ حرمت والا ہی رہے گا۔ مجھ سے پہلے یہاں کسی کے لیے بھی جنگ حلال نہ تھی اور مجھے بھی ایک مخصوص ساعت میں اجازت ملی ہے۔ لہٰذا یہ اللہ کی طرف سے حرام قرار دیئے جانے کی وجہ سے قیامت تک کے لیے حرام ہے۔ اس کی حدود میں

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الحج، باب لا ینفّر صیدُ الحرم۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب تحریم مکۃ وصیدہا وخلاہا ۔۔۔۔۔ مسند امام احمد، ج ۱، ص ۲۵۳۔ حدیث ۲۲۷۹۔ تخریج شاکر۔

خودرو پودے نہ کاٹے جائیں، یہاں پر موجود شکار کا پیچھا نہ کیا جائے، گری پڑی چیز نہ اٹھائی جائے
ہاں وہ آدمی اٹھا سکتا ہے جو اس کا اعلان کرے اور یہاں کی سرسبز گھاس نہ کاٹی جائے۔"

تاریخ گواہ ہے کہ مکہ مکرمہ تاریخ انسانیت میں سب سے زیادہ پُرامن مقام رہا ہے اور جس نے اس کے احترام کو پامال کرنے کی کوشش کی اُس نے منہ کی کھائی۔ 'اصحاب الفیل' یعنی ہاتھی والوں کا واقعہ اس کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ یہ تاریخی معجزہ سورت الفیل میں بیان ہوا ہے۔ دورِ جاہلیت میں ریگستانِ عرب کا سارا علاقہ مستقل بدامنی اور بے چینی کی لپیٹ میں رہا ہے اور اگر کسی کو امن، سکون، سکھ اور چین نصیب ہوا ہے تو وہ صرف اہلِ مکہ کو، خواہ وہ شہرِ مکہ میں رہے ہوں یا مسافر بن کر کرۂ ارضی پر گھومتے رہے ہوں۔ سورت القریش اس کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ باہم خون کے پیاسے بھی حدودِ مکہ میں ایک دوسرے پر ہاتھ نہ اُٹھاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا[1]

"جو اس میں داخل ہو گیا امن پا گیا۔"

بیت اللہ شریف زَادَهُ اللّٰهُ عِزًّا وَّشَرَفًا، جسے ابتداء میں حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ[2]

"بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت بنایا گیا۔"

بعد کے مرحلے میں اس کی تعمیرِ جدید حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما الصلاۃ والسلام نے کی۔

---

[1] سورت آل عمران، آیت ۹۷۔

[2] سورت آل عمران، آیت ۹۶

اللہ تعالیٰ نے اسے اہلِ توحید کا قبلہ قرار دیا اور ان دونوں عظیم المرتبت پیغمبروں کی ذمہ داری ٹھہرائی کہ وہ دونوں خود اس گھر کی صفائی ستھرائی کا اہتمام کریں۔ چنانچہ فرمایا:

وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ[1]

"اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو تاکید کی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔"

اس جلیل القدر اور عظیم المرتبت شہر میں اور پھر بیت اللہ الحرام جیسے ازل سے روزِ قیامت تک حرمت والے مقام پر بھی جو بدبخت اور بدنصیب دنگا، فساد، فسق و فجور، قتل و غارت گری یا کوئی ایسی حرکت کرے جس سے حقوق اللہ اور حقوق العباد پامال ہوتے ہوں تو یقیناً اس نے اپنے سر پر بڑی آفت اور شامت لے لی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ[2]

"اس (مسجد حرام) میں جو بھی راستی سے ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرنا چاہے گا اسے ہم دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَبْغَضُ النَّاسِ اِلَى اللهِ ثَلَاثَةٌ: مُلْحِدٌ فِي الْحَرَمِ وَمُبْتَغٍ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ، وَمُطَّلِبُ دَمِ امْرِئٍ بِغَيْرِ حَقٍّ لِيُهْرِيْقَ دَمَهُ[3]

"اللہ تعالیٰ کو تین آدمیوں پر سب سے زیادہ غصہ آتا ہے: حدودِ حرم میں زیادتی کرنے والا، اسلام

---

[1] سورت البقرۃ، آیت ۱۲۵۔

[2] سورت الحج، آیت ۲۵۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الدیات، باب من طلب دم امرئٍ بغیر حق۔

میں جاہلانہ و مشرکانہ طریقے تلاش کرنے والا، اور کسی ناحق خون کو بہانے کے لیے اس کے درپے ہونے والا۔"

ایک دوسرے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ اَعْدَی النَّاسِ عَلَی اللّٰہِ مَنْ قَتَلَ فِی الْحَرَمِ اَوْقَتَلَ غَیْرَ قَاتِلِہٖ اَوْقَتَلَ بِذُحُوْلِ الْجَاھِلِیَّۃِ۔[1]

"اللہ کے سامنے سب سے زیادہ ڈھیٹ اور سرکش وہ آدمی ہے جس نے حدودِ حرم میں کسی کو قتل کیا، یا ایسے آدمی کو قتل کیا جو اس کے مقتول کا قاتل نہ تھا، یا زمانہ جاہلیت والی دشمنی کی بنا پر کسی کو قتل کیا۔"

اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ شریف کی عزت و حرمت میں خلل اندازی کو کبائر میں شمار فرمایا ہے۔ ارشاد ہوا:

"بڑے بڑے گناہ نو ہیں۔ اللہ کے ساتھ شرک کرنا، مومن کو ناحق قتل کرنا، جادو کرنا، میدان جنگ سے فرار ہونا، یتیم کا مال کھانا، سود کھانا، پاک دامن اور عفیف عورتوں پر زنا کا الزام لگانا، والدین کی نافرمانی کرنا، اور بیت اللہ الحرام کی عزت پامال کرنا۔"[2]

حرم مکہ اور بیت اللہ شریف کے جو فضائل کتاب و سنت کی روشنی میں معلوم ہوئے ہیں ان کو سامنے رکھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اس مقدس و محترم مقام کی حرمت کو پامال کرنا واقعۃً عظیم ترین جرم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِنَّہٗ سَیُلْحِدُ فِیہِ رَجُلٌ مِنْ قُرَیْشٍ لَو وُزِنَتْ ذُنُوْبُہٗ بِذُنُوْبِ

---

[1] مسند امام احمد ج ۲/ص ۱۷۹، حدیث ۶۶۸۱ تحقیق احمد محمد شاکر طبع دار المعارف مصر۔ حدیث صحیح ہے۔

[2] سنن ابی داؤد، کتاب الوصایا، باب ماجاء فی التشدید فی اکل مال الیتیم۔
سنن النسائی، کتاب تحریم الدم، باب ذکر الکبائر۔
المستدرک، کتاب الایمان، باب الکبائر تسع ۱/ ۵۹۔ حدیث حسن ہے۔

الثَّقَلَيْنِ لَرَجَحَتْ[1]

"خاندان قریش کا ایک آدمی حدودِ حرم کو پامال کرے گا، اگر انسانوں اور جنوں کے تمام گناہوں کو ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور اس کے گناہوں کو دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو اس کے گناہوں کا پلڑا جھکا ہوا ہوگا۔ یعنی اس کے گناہ زیادہ ہوں گے۔"

اس الحاد، زیادتی اور ظلم کے مفہوم میں صرف بڑے بڑے گناہ ہی شامل نہیں ہیں، بلکہ بڑا گناہ تو بڑا ہے ہی، یہاں ہر وہ گناہ اور جرم و قصور بھی بڑا ہو جاتا ہے جو اس مقام کی عظمت و حرمت اور شان کے خلاف ہو، خواہ فی نفسہٖ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین رحمہم اللہ کے اقوال و آثار پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدودِ حرم میں بلا ضرورت قسم کھانے، ضرورت کی چیزوں کی ذخیرہ اندوزی کرنے، کسی نوکر یا خادم کو ڈانٹنے یا اہلِ خانہ کو سخت سُست کہنے کو بھی حرم کی عزت و احترام کے خلاف شمار کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایک خیمہ حدودِ حرم کے اندر لگاتے اور ایک خیمہ حدودِ حرم سے باہر۔ اگر کسی وقت گھر کے کسی فرد کو ڈانٹنا ہوتا تو حدودِ حرم سے باہر والے خیمے میں چلے جاتے۔ کسی صاحب نے اُن سے اس احتیاط کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے فرمایا:

"صحابۂ کرام، اہلِ خانہ کو سخت سُست کہنے کو بھی حرم اور بیت اللہ کی حرمت اور تعظیم کے خلاف سمجھتے تھے۔"[2]

---

[1] مسند امام احمد، ج ۲، ص ۱۳۶۔ حدیث ۶۲۰۰۔ احمد محمد شاکر کی تحقیق کے مطابق حدیث صحیح ہے۔

[2] الزواجر، تالیف ابن حجر الہیثمی، ج ۱، ص ۲۰۰۔

ضرورت رشتہ

شیخ قانونگو خاندان کی ایک لیڈی ڈاکٹر، عمر ۳۴ سال، کے لئے شریف اور باعزت گھرانے سے رشتہ درکار ہے۔ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا چاہیے، ذات پات کی کوئی قید نہیں۔
برائے رابطہ، ع۔ س، معرفت ماہنامہ میثاق، ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور

وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

ذکر اللہ کا مطلب ہے اللہ کی یاد۔ اللہ تعالیٰ جو ساری کائنات کا خالق و مالک ہے اس قابل ہے کہ اسے ہمہ وقت یاد کیا جائے اور یاد رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر زبان سے بھی ہے اور عمل سے بھی۔ اس دور کے بعض مادہ پرست ذہن جنہیں روحانی بالیدگی میسر نہیں ہے کہہ اٹھتے ہیں کہ زبان سے اللہ کا ذکر چہ معنی دارد۔ مگر یہ ان کی غلط فہمی ہے' کیونکہ صرف زبان سے اللہ کا ذکر بھی اعلیٰ درجہ کی تاثیر کا حامل ہے۔ اگر اسے مادی مثال سے ہی سمجھنا ہو تو ایک سنگلاخ چٹان پر پانی کا قطرہ قطرہ گرتے دیکھئے۔ یہ قطرہ بظاہر نہایت کمزور' حقیر اور ملائم سی چیز ہے' مگر جب یہ لگاتار ایک مدت تک ایک ہی جگہ گرتا رہے تو سنگلاخ چٹان میں سوراخ کر دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ بعض اوقات بظاہر چھوٹا سا عمل پیہم مشق سے حیرت انگیز نتائج پیدا کرتا ہے اور پھر ذکر اللہ تو چھوٹا عمل بھی نہیں۔ خالقِ کائنات نے قرآن پاک میں اللہ کے ذکر کو سب چیزوں سے بڑا قرار دیا ہے' ملاحظہ ہو سورۃ العنکبوت آیت ۴۵: وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ (اور اللہ کا ذکر تو سب سے بڑی چیز ہے۔)

کہتے ہیں کہ قیامت کے دن جنتیوں کے لئے سب سے بڑی نعمت دیدارِ الٰہی ہوگا۔ اس میں ایسی لذت ہوگی کہ ناظرین رویت باری تعالیٰ سے نظر ادھر ادھر کرنا گوارا نہ کریں گے۔ بھلا اس ہستی کا ذکر بے اثر ہو سکتا ہے؟

دنیا میں ہمیں کسی شخص سے اس کے باکمال ہونے یا باکردار ہونے کی وجہ سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مشاہدہ ہے کہ جب کسی محفل میں ہماری اس پسندیدہ شخصیت کا ذکر ہوگا تو ہماری دلچسپی اس میں بڑھتی جائے گی۔ نیز ہم کسی محفل میں بیٹھے ہوں تو ہمارا دل چاہے گا کہ کسی نہ کسی طور اپنی محبوب شخصیت کا تذکرہ شروع کریں' یعنی اس کا ذکر اپنے احباب کے سامنے کریں۔ یہی تو ذکر ہے۔ بلکہ ایک شخص کو ایک خاص فن محبوب ہے' وہ

اس فن کا شیدائی ہے، تو اپنے محبوب فن کا ذکر اور تذکرہ اس کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

اب سمجھئے کہ انسان کو اشرف المخلوقات بنانے والا کون ہے؟ اسے موزوں قامت، حسین شکل و صورت، ذہنی اور دماغی صلاحیتیں جن سے وہ کائنات کو مسخر کرنے کے قابل ہوا، کس نے دیں؟ اللہ نے۔ تو بس جو شخص کائنات کی اس اشرف صنف یعنی بشریت سے تعلق رکھتا ہے اس کا سب سے بڑا محسن اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ اور محسن کے سامنے اظہارِ نیاز مندی اخلاق کی ایک معروف خوبی ہے۔ محسن کے ساتھ محبت اور لگاؤ فطرتِ سلیمہ کا مسلّمہ تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص انسانیت سے عاری نہ ہو تو اللہ کے ساتھ اس کی انتہائی محبت عالمگیر سچائی کا درجہ رکھے گی۔ اسی حقیقت کو قرآن شریف میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان والے ہیں ان کو سب سے زیادہ محبت اللہ کے ساتھ ہے۔ دیکھئے سورۃ البقرہ آیت ۱۶۵:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ

"اور بعض لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو۔ ان سے محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی، اور ایمان والوں کو اس سے زیادہ تر ہے محبت اللہ کی۔"

ظاہر ہے کہ خدا کی محبت اسی کو ہوگی جو حق شناس اور حقیقت آشنا ہوگا۔ پھر انبیائے کرامؑ فہم و بصیرت، عقل و سمجھ، حق شناسی اور حقیقت آشنائی کی معراج پر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی محبت کا مرکز و محور ذاتِ الٰہی اور دن رات کا وظیفہ ذکرِ الٰہی ہوتا تھا۔ چونکہ انبیاء و رسل مقصدِ حیات سے آگاہ تھے اسی لئے انہوں نے نہ صرف خود اللہ کے ذکر کو ہمہ وقت کا معمول بنایا بلکہ نصح و خیر خواہی کے جذبے کے تحت تمام انسانوں کو بھی ذکرِ الٰہی کی طرف دعوت دی۔ ایک شخص کو جس چیز کی معرفت ہوگی وہی اس کی قدر کرسکے گا ع قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند گوہری! ایک ہی چیز کی مختلف اشخاص کے ذہنوں میں قدر و قیمت مختلف ہوگی۔ یعنی افراد کو اس شے کی معرفت کے تناسب سے ہی قدر ہوتی ہے اور ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی

معرفت سب سے زیادہ انبیاء و رسل کو ہوتی ہے، چنانچہ وہی اس عظیم الشان ہستی کے صحیح قدردان ہوتے ہیں اور ہمیشہ ذکرِ الٰہی میں مشغول نظر آتے ہیں۔

چونکہ انسان کا محسنِ اعظم اللہ تبارک و تعالیٰ ہے لہٰذا شدید ترین محبت اسی کا حق ہے۔ اگر کوئی شخص محسنِ اعظم یعنی محسنِ حقیقی کو چھوڑ کر شدید ترین محبت کا حق کسی دوسرے کے لئے تسلیم کرتا ہے تو یہ سب سے بڑی حماقت ہے اور اسی کو شرک کہتے ہیں اور یہی بدترین گناہ ہے جو اللہ کے غضب کو بھڑکاتا ہے۔ دنیا میں ہم صاحبِ کمال لوگوں سے ان کی صلاحیتوں کے مظاہرے پر متأثر ہوتے ہیں اور ان کی محبت اور کشش کا پیدا ہوجانا بھی فطری امر ہے، مگر یہ حقیقت کبھی نظر سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے کہ ان صاحبِ کمال لوگوں کی یہ صلاحیتیں اسی خدائے واحد کی عطا کردہ ہیں جس کے قبضہ میں عزت دینا اور ذلت دینا ہے۔ یہ صلاحیتیں کسی کی ذاتی نہیں ہیں، بلکہ خدا کی عطا کردہ ہیں۔ وہ کسی کو صلاحیت دے بھی سکتا ہے اور چھین بھی سکتا ہے۔ اگر یہ حقیقت انسان کو مستحضر رہے تو اس کے جادۂ حق سے بھٹکنے کا امکان ختم ہوجاتا ہے۔

اللہ کا ذکر روح کی غذا اور قلب کی تسکین ہے۔ اس کی لذت سے وہی شخص آشنا ہے جسے اس کا تجربہ ہے۔ ذکر اللہ کا سب سے بڑا مظہر خود قرآن پاک یعنی کلامِ الٰہی ہے، اسے "الذکر" کہا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۃ الحجر آیت ۹:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝

"بیشک ہم نے ہی اس ذکر (یعنی قرآن) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

گویا قرآن پاک سراسر ذکر ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمان قرآن کی عظمت کے کماحقہ قائل تھے۔ ان کے ہاں بہترین مشغولیت قرآن کا سیکھنا اور سکھانا تھا۔ بخاری شریف میں حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ

"تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن کا علم حاصل کرے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے۔"

یہی قرآن سینوں کی بیماریوں یعنی اخلاقی کمزوریوں کا علاج ہے۔ دیکھئے سورۃ یونس آیت ۵۷:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَ
رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ○

"اے لوگو تمہارے پاس نصیحت آئی ہے تمہارے رب کی طرف سے اور یہ شفا ہے اس کے لئے جو سینوں میں ہے اور ہدایت اور رحمت ہے ایمان والوں کے لئے۔"

نیز دیکھئے سورۂ بنی اسرائیل آیت ۸۲:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ

"اور ہم نے اتارا قرآن جو شفا اور رحمت ہے ایمان والوں کے لئے۔"

اللہ کے ذکر سے طمانیتِ قلبی نصیب ہوتی ہے۔ دیکھئے سورۃ الرعد آیت ۲۸

الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ○

"وہ لوگ جو ایمان لائے اور چین پاتے ہیں ان کے دل اللہ کی یاد سے۔ سنتا ہے! اللہ کی یاد ہی سے چین پاتے ہیں دل۔"

علاوہ ازیں بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بنی آدم کے قلوب پر اسی طرح زنگ چڑھ جاتا ہے جس طرح پانی لگ جانے سے لوہے پر زنگ آجاتا ہے۔" عرض کیا گیا: حضورؐ دلوں کے اس زنگ کے دور کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: "موت کو زیادہ یاد کرنا اور قرآن کی تلاوت!"

بات ہو رہی ہے اللہ کے ذکر کی۔ تو قرآن میں نماز کو بھی اللہ کا ذکر کہا گیا ہے۔
دیکھئے سورۃ طٰہٰ آیت ۱۴

إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي

"بیشک میں اللہ ہوں، کوئی معبود نہیں سوائے میرے، پس میری عبادت کرو اور قائم کرو نماز میرے ذکر کے لئے۔"

قرآن پاک میں ہے کہ ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے رہو۔ دیکھئے سورۃ النساء آیت ۱۰۳

فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ

"اللہ کا ذکر کرو کھڑے' بیٹھے اور اپنے پہلوؤں کے بل لیٹے۔"

ترمذی شریف کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر اللہ کو "افضل الاعمال" فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن بسرؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا: یا رسول اللہ' آدمیوں میں کون بہتر ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: "جن کی عمر زیادہ ہو اور عمل اچھے ہوں۔" پھر اس نے پوچھا: اعمال میں کونسا عمل بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "یہ کہ تم دنیا سے رخصت ہو اور اس وقت تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو۔"

ظاہر ہے کہ یہاں زبان کے ذکر ہی کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔

اللہ کے ذکر یعنی اس کی حمد و ثنا کے لئے موزوں ترین کلمات کون سے ہیں۔ اول تو قرآنی آیات ہیں جو ذکر کا اولین مصداق ہیں' کیونکہ قرآن تو ہے ہی الذکر' دوسرے وہ جملے جو حدیث کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم کردہ ہیں' اصلاً وہ بھی آیاتِ قرآنی سے ماخوذ ہیں' مثلاً تسبیح' تحمید' تمجید' تکبیر وغیرہ۔

جہاں تک اوقات ذکر کا تعلق ہے تو ذکر الٰہی کیلئے ہر وقت موزوں ہے' البتہ خصوصی طور پر صبح و شام کے اوقات اور فراغت کا کوئی بھی وقت مناسب ہے۔ جس طرح ہر کام کیلئے کچھ پیشگی شرائط ہوتی ہیں جو اس کام کے مثبت نتائج کیلئے لوازم کا درجہ رکھتی ہیں اسی طرح ذکر اللہ کے لئے بھی کچھ لوازمات ہیں۔ اول زندگی کے معمولات معصیت سے پاک ہوں' یعنی خشیت الٰہی کا عنصر اقوال و افعال میں نمایاں ہو۔ دوم رزق حلال کا اہتمام ہو اور آخری بات یہ کہ ذکر اللہ میں خلوص ہو اور یہ معمولی سی ریاکاری اور ادنیٰ سی نمائش سے بھی پاک ہو اور اس کا مقصد صرف حصول رضائے الٰہی ہو اور بس!

ضرورت رشتہ

پیرس میں تنظیم اسلامی کی شاخ کے ایک رکن کے لئے جن کی عرب بیوی حال ہی میں انتقال ہوا ہے اور اس سے ایک اڑھائی سالہ بیٹی بھی ہے' اسلامی شعائر کی پابند' حافظہ قرآن اور خوبصورت و خوب سیرت لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔ عمر اور ذات پات کی کوئی قید نہیں۔ رابطہ محمد صادق 11 RUE F. PELLOUTIER
94500 CHAMPIGNY S/M FRANCE

انفاق کا معیارِ مطلوب

الفاظ قرآنی 'قل العفو' کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد عثمان، مؤلف "الکتاب" (ترجمۂ قرآن)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ: ۲۱۹)

"(اے پیغمبر) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ (راہِ خدا میں) کیا خرچ کریں؟ تم ان سے کہہ دو کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو"۔

عہدِ حاضر کے بعض مفسرینِ قرآن اور دانشور حضرات جو اشتراکی ذہن رکھتے ہیں اس آیت سے یہ معنی مراد لیتے ہیں کہ اسلام مال و دولت جمع کرنے کو ناجائز قرار دیتا ہے اور ثبوت میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا حوالہ دیتے ہیں جو مال و دولت جمع کرنے کے سخت خلاف تھے اور جن کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ اگر ان حضرات کی یہ تشریح درست تسلیم کرلی جائے تو آیتِ مذکورہ مندرجہ ذیل آیات سے متصادم نظر آتی ہے جن میں اہلِ ایمان کی صفت انفاق فی سبیل اللہ بیان کی گئی ہے:

۱- وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُونَ (البقرہ: ۳، الانفال: ۳، الحج: ۳۵)

"اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے (راہِ خدا میں بھی) خرچ کرتے ہیں"۔

۲- لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ (آلِ عمران: ۹۲)

"تم نیکی کے درجے کو ہرگز نہ پہنچ سکو گے جب تک تم (خدا کی راہ میں) ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو گے جو تمہیں عزیز ہیں"۔

۳- وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ (الحدید: ۷)

"اور خرچ کرو اس (مال) میں سے (اللہ کی راہ میں) جو اس نے تمہیں دیا ہے اپنا نائب بنا کر"۔

۴۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (التوبہ: ۱۰۳)
"(اے پیغمبر) تم ان کے اموال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو کہ اس کے ذریعہ سے تم ان کو پاک و صاف کردو گے"۔

مندرجہ بالا خط کشیدہ الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ کُل اموال کا اِنفاق مطلوب نہیں کہ اس سے احکامِ زکوٰۃ و حج ساقط ہوجاتے ہیں۔ زکوٰۃ کا نصاب ساڑھے باون تولہ چاندی یا سات تولے سونا یا اس کی قیمت کے مساوی زرِ نقد ہے' جس پر ایک سال کی مدت گذرنے کے بعد ہی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔ اسی طرح حج کی فرضیت صاحبِ استطاعت پر ہے۔ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا[1] (آلِ عمران: ۹۷) پس زکوٰۃ اور حج کے لئے دولت جمع کرنا ضروری ہوا۔

یہاں یہ بات جان لینا ضروری ہے کہ اسلام میں خیرات کے دو درجے ہیں' ایک قانونی اور دوسرا اخلاقی۔ قانونی خیرات تو وہی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ وہ کم سے کم خیرات ہے جس کا سالانہ ادا کرنا ہر صاحبِ نصاب پر واجب ہے اور اس کا وصول اور خرچ کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ رہی اخلاقی خیرات تو اس کو اسلام نے ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے اور اس بارے میں کوئی جبر و اکراہ نہیں۔ اخلاقی خیرات کی تابناک مثالیں تاریخِ اسلام کا روشن باب ہیں۔ غزوۂ تبوک کے لئے جب حضورِ اکرمؐ نے چندہ کی اپیل کی تو حضرت عثمانؓ نے نو سو اونٹ' ایک سو گھوڑے اور ایک ہزار دینار پیش کئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ۴۰ ہزار درہم لا حاضر کئے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے مال کا بیشتر حصہ لا کے ڈھیر کردیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پورا گھر خالی کر کے سب کچھ حاضر کردیا۔ لیکن شاید سب سے زیادہ ایثار اس غریب محنت کش انصاری کا تھا جس نے دن بھر پانی کھینچ کھینچ کر چار سیر چھوہارے کمائے اور دو سیر چھوہارے اہل و عیال کے لئے رکھ کر باقی دو سیر حضور کے قدموں میں ڈال دئے[2]

حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور

۱۔ (ترجمہ) "اور لوگوں پر فرض ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہے وہ اس کا حج کرے۔"

۲۔ محسن انسانیت از نعیم صدیقی' اشاعت ہشتم' ص ۴۵۸

حضورؐ کی زبانِ مبارک سے لوگوں نے اس کو سنا "مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗ اَجْرٌ کَرِیْمٌ"[۳] (الحدید: ۱۱) تو حضرت ابو الدحداح انصاریؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ" اللہ تعالیٰ ہم سے قرض چاہتا ہے؟ حضورؐ نے جواب دیا: ہاں۔ انہوں نے کہا: ذرا اپنا ہاتھ مجھے دکھایئے۔ آپؐ نے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے آپؐ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: " میں نے اپنے رب کو اپنا باغ قرض میں دے دیا"[۴] حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اس باغ میں کھجور کے چھ سو درخت تھے اور اسی میں ان کا گھر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات کر کے وہ سیدھے گھر پہنچے اور بیوی کو پکار کر کہا "دحداح کی ماں' باہر نکل آؤ' میں نے یہ باغ اپنے رب کو قرض دے دیا ہے"۔ وہ بولیں: "تم نے نفع کا سودا کیا دحداح کے باپ"۔ اور اسی وقت اپنا سامان لے کر باغ سے نکل گئیں۔ اللہ اکبر!

دراصل جس حقیقت کی طرف ان مفسرین اور دانشوروں کی نظر نہیں گئی وہ یہ ہے کہ جس طرح عام نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور وہ رفتہ رفتہ اپنی تکمیل کو پہنچی اسی طرح زکوٰۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی ترغیب بھی ابتدائے اسلام ہی سے شروع ہوئی لیکن اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا۔ پس آیۂ "قُلِ الْعَفْوَ" بھی زکوٰۃ کے تعین کی راہ میں اسلام کا پہلا قدم ہے۔ صحیح بخاری (کتاب الزکوٰۃ) میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول نقل ہوا ہے جس کا مطلب ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ جو کچھ بچے وہ اللہ کی راہ میں خیرات کردیں اور آئندہ کے لئے کچھ بچا نہ رکھیں' کیونکہ اس وقت اسلام اور مسلمان کی حالتِ غربت اور تنگی اس کی متقاضی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد جب مسلمانوں کو فتوحات حاصل ہوئیں اور ان کو زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں اور تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ

۳۔ (ترجمہ)" کون ہے جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے اور اس کے لئے بہترین اجر ہے۔"

۴۔ تفہیم القرآن از سید ابوالاعلیٰ مودودی' جلد پنجم' ص ۳۰۱ حاشیہ ۱۶

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جو کچھ تم نے (محنت مزدوری یا تجارت سے) کمایا ہے اور جو کچھ ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے اس میں سے عمدہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ کرو"۔ (البقرہ:۲۶۷)

لیکن اس وقت تک تمام عالمِ عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوا تھا اور اس کا کوئی قومی نظام بھی نہ تھا' لیکن رمضان ۸ھ میں مکہ کی فتح نے تمام عرب کو ایک سررشتہ میں منسلک کردیا۔ اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا خاص نظام قائم کرے۔ چنانچہ نئے سال یعنی محرم ۹ھ میں زکوٰۃ کے تمام احکامات و قوانین مرتب ہوئے اور اس کی وصولی کے لئے عاملین کا تقرر ہوا اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی یہ تمام احکام و قوانین سورۃ التوبہ میں مذکور ہیں جو ۹ھ کے لگ بھگ نازل ہوئی۔[۵]

سنن ابی داؤد[۶] میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب سورۃ التوبہ کی آیت[۷] ۳۴ نازل ہوئی تو جو صحابہ کرامؓ دولتمند تھے بہت گھبرائے اور کہنے لگے کہ اس آیت کی رُو سے ہم سب گنہگار ٹھہرے' اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں اس آیت کا مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کر آتا ہوں' چنانچہ حضرت عمرؓ حضورِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے نبی اللہؐ یہ آیت آپؐ کے صحابہ پر گراں ہوئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے اموال کو پاک کردے۔ پس جس مال پر زکوٰۃ دی گئی ہو وہ پاک ہوگیا اور کنز نہیں رہا۔ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔

حضرت ابو ذر غفاریؓ اور ان کا نظریۂ انفاق

خلافتِ راشدہ کے عہد میں حضرت عثمانؓ کی حکومت کا دَور وہ زمانہ ہے جب عرب

۵۔ سیرت النبی از شبلی نعمانیؒ جلد پنجم ص ۲۲۵۔۲۲۷ مطبوعہ لاہور۔

۶۔ صحاح ستہ کی تیسری کتاب مؤلف امام ابوداؤدؒ ۲۰۲ھ تا ۲۷۵ھ

۷۔ والذین یکنزون الذھب و الفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم ○ (ترجمہ)" جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو (اے پیغمبر تم) ایسے لوگوں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو۔"

میں دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی حضرت ابو ذر غفاریؓ نے شام میں سورۃ التوبہ کی آیت "وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ الخ" کے مطابق یہ فتویٰ دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے اور ہر شخص کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی راہ میں دے دے۔ شام کے دولتمند صحابہ کرامؓ نے ان کی مخالفت کی اور کہا کہ ہم خدا کی راہ میں دے کر بچاتے ہیں[۸] حضرت ابو ذرؓ نے امیر معاویہؓ پر بھی تنقید کرنا شروع کردی۔ امیر معاویہؓ اپنا محل الخضراء تعمیر کروا رہے تھے۔ ایک دن حضرت ابوذرؓ کا ادھر سے گذر ہوا، آپؓ نے حضرت معاویہؓ سے فرمایا: "اگر اس محل کی تعمیر اللہ کے مال سے ہو رہی ہے تو یہ خیانت ہے اور اگر آپ اس پر اپنا مال خرچ کر رہے ہیں تو یہ اسراف ہے"[۹] حضرت معاویہؓ نے ان کی شکایت امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ کو لکھ بھیجی۔ حضرت عثمانؓ نے انہیں مدینہ بلوالیا، لیکن ان کے انتہا پسندانہ خیالات دیکھ کر حضرت عثمانؓ نے انہیں فتویٰ دینے سے منع کیا۔ حضرت ابو ذرؓ کو یہ پابندی گوارا نہ ہوئی۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ ربذہ چلے جائیں جو صحرائے عرب میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ چنانچہ ابو ذرؓ اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر بخوشی ربذہ چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا[۱۰]

انفاق کے بارے میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا انتہا پسندانہ نظریہ ان کے انتہائی زہد و ورع کا نتیجہ تھا اور جیسا کہ اوپر کے بیان سے ظاہر ہے وہ اپنی اس رائے میں منفرد ہیں۔ صحابہؓ میں سے کسی نے بھی ان کی تائید نہیں کی۔ یہاں ہم عبداللہ بن مسعودؓ کی مثال پیش کریں گے جو غلط فہمی کی بنا پر معوذتین کو قرآن کا جزو نہیں سمجھتے تھے، لیکن حضورِ اکرم کے عہدِ مبارک سے آج تک تمام دنیائے اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ معوذتین قرآن کا جزو ہیں۔ تنہا عبداللہ بن مسعودؓ کی رائے ان کی جلالتِ قدر کے باوجود اس عظیم اجماع کے مقابلے میں کوئی وزن نہیں رکھتی۔

۸۔ سیرت النبی از شبلی نعمانی جلد پنجم، ص ۲۷۲۔ ۲۷۳ مطبوعہ لاہور

۹۔ عظمتِ صحابہؓ مولف محمد ادریس بھوجیانی مطبوعہ لاہور ص ۱۷۹

۱۰۔ تیس پروانے شمع رسالت کے، از طالب ہاشمی، ملاحظہ ہو مضمون حضرت ابوذر غفاریؓ خلیلِ رسولؐ

"محض دعوت دعوت کی رٹ لگا کر دین قائم نہیں ہو جائیگا"

اسلام کے حرکی و انقلابی تصور کی بیخ کنی کی مذموم کوشش پر قافلہ تحریک اسلامی کے ایک دیرینہ شریک کا سوزِ دروں اور اظہارِ رنج و افسوس!

(محترم شمیم احمد صدیقی کا مراسلہ جناب جاوید احمد غامدی کے نام)

ذیل میں نیویارک سے موصول شدہ جناب شمیم صدیقی صاحب کا ایک مراسلہ شائع کیا جارہا ہے جو صدیقی صاحب نے "اشراق" کے مدیر جاوید احمد غامدی صاحب کو آج سے قریباً تین ماہ قبل ارسال کیا تھا۔ محترم صدیقی صاحب تحریک جماعت اسلامی کے ان دیرینہ وابستگان میں سے ہیں جو اپنی پیرانہ سالی کے باوصف آج بھی اپنی تحریکی فکر کی ترویج و اشاعت میں منہمک ہیں اور اسی ناطے امیر تنظیم اسلامی سے بھی خصوصی تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ اس مراسلے کی ایک کاپی صدیقی صاحب نے ہمیں ارسال کی تھی کہ اگر غامدی صاحب ان کے خیالات کو اپنے پرچے میں شائع نہ کریں تو انہیں "میثاق" میں جگہ دی جاسکے۔ اور چونکہ تین ماہ کا عرصہ گزرنے کے باوجود اس مراسلے کا کوئی تذکرہ "اشراق" میں نظر نہیں آیا لہٰذا محترم صدیقی صاحب کی خواہش کے احترام میں اسے شاملِ "میثاق" کیا جارہا ہے۔

یہ مراسلہ بنیادی طور پر جاوید صاحب کے اس مضمون پر تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے جو روزنامہ نوائے وقت میں تین اقساط میں شائع ہوا تھا اور جس میں جاوید صاحب نے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے تحریکی و انقلابی فکر کو ہدفِ تنقید ہی نہیں، طنز و استہزاء کا نشانہ بنایا تھا۔ یہی مضمون بعد میں یکجا شکل میں "اشراق" میں بھی شائع کیا گیا۔ گو شمیم صدیقی صاحب بیعت کے مسئلے میں محترم ڈاکٹر صاحب سے متفق نہیں ہیں لیکن اس تحریکی و انقلابی فکر میں ڈاکٹر صاحب کے ہم زبان ہیں جس کا شعور اجاگر کرنے میں اولاً جماعت اسلامی کے مؤسس مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور نے اہم کردار ادا کیا تھا اور پھر مولانا امین احسن اصلاحی کی جاندار اور مدلل تحریروں نے اسے نکھار بخشا تھا۔ دلچسپ بلکہ افسوسناک بات یہ ہے کہ جناب غامدی صاحب ایک جانب مولانا مودودی کے ساتھ اپنا فکری رشتہ جوڑتے اور انہیں ایک آئیڈیل مفکر و داعی کے طور پر پیش کرتے اور مولانا اصلاحی

کو باہتمام "استاذ امام" قرار دیتے ہیں لیکن دوسری جانب درپردہ ان کے تحریکی فکر کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہیں۔ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ غامدی صاحب کو اصل عناد محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی ذات سے ہے یا وہ ان کے پیش کردہ تحریکی و انقلابی فکر سے کد رکھتے ہیں۔ بہرکیف اصل معاملہ خواہ کچھ بھی ہو نتیجہ اس کا یہ ہے کہ وہ جوشِ مخالفت میں محترم ڈاکٹر صاحب کے تحریکی افکار کی نفی کرتے کرتے اپنے ممدوح مولانا مودودی مرحوم اور اپنے "استاذ امام" مولانا امین احسن اصلاحی' دونوں کے فکر کی جڑوں پر بھی بے دریغ تیشہ چلا رہے ہیں۔ حالانکہ یہ دو بزرگ وہ ہیں کہ جن کے ساتھ غامدی صاحب اپنا فکری رشتہ جوڑنے میں ہمیشہ بڑا فخر محسوس کرتے ہیں!! ع خامہ انگشت بدنداں ہے' اسے کیا لکھیے!

اس سلسلے کی ایک تازہ مثال غامدی صاحب کی ایک "شاہکار" تصنیف "قانونِ دعوت" کے حوالے سے سامنے آئی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ کتاب جو ۹۴ صفحات پر محیط ہے' اس کا نصفِ آخر (یعنی ص ۴۸ تا ۹۴) تو کُل کا کُل مولانا امین احسن اصلاحی کی معرکۃ الآراء تصنیف "دعوتِ دین اور اس کا طریق کار" کے اقتباسات سے بھرا ہوا ہے' چنانچہ اس حصے میں کوئی ایسا ورق تلاش کرنا مشکل ہو گا جس میں "استاذ امام" کی کتاب سے کوئی اقتباس درج نہ ہو' بلکہ یہ اقتباسات اس کثرت کے ساتھ ہیں کہ انہیں پڑھتے ہوئے اس پہلو سے شدید الجھن ہونے لگتی ہے کہ اگر سب کچھ مولانا اصلاحی صاحب ہی کے حوالے سے بیان کرنا تھا اور ایسا بھی نہیں ہے کہ مولانا کی کتاب مارکیٹ میں دستیاب نہ ہو' تو آخر اسے ایک نیا پیراہن دے کر اپنی تصنیف کے طور پر شائع کرنے کی ضرورت کیا تھی' لیکن کتاب کا نصفِ اول درحقیقت مولانا اصلاحی صاحب ہی کے فکر کی تردید پر مشتمل ہے۔ کتاب کے اس حصے میں محترم ڈاکٹر صاحب کے تحریکی فکر پر جابجا استہزائیہ انداز میں طنز کے تیر برسا کے اگرچہ مولف نے یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ کتاب ان کے افکار کے رد میں تحریر کی گئی ہے لیکن فی الاصل صاحبِ کتاب بڑے لطیف پیرائے میں اپنے "استاذ امام" کے افکار کی جڑوں پر تیشہ چلا گئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کتاب مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے ساتھ ایک سنگین مذاق کا درجہ رکھتی ہے۔ کتاب کا نصفِ اول مولانا امین احسن اصلاحی کی بلند پایہ تصنیف کے اہم ترین باب "تبلیغ کس لئے" کی من جملہ تردید و تغلیط پر مشتمل ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے' مختصراً یہ کہ مولانا قرآن و حدیث کے نصوص کی بنا پر یہ رائے

رکھتے ہیں اور اسے انہوں نے اپنی کتاب میں پر زور طریقے پر پیش کیا ہے کہ خلافت کے ادارے کے منتشر ہو جانے کے بعد اب دعوت و تبلیغ کے جماعتی فرض کی ادائیگی کے لئے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس ادارۂ خلافت کو قائم کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائیں (دعوتِ دین اور اس کا طریق کار' صفحہ ۴۶-۴۷)۔ چنانچہ مولانا دعوت کے ساتھ ساتھ مرحلۂ ہجرت و براءت اور جنگ و قتال کو بھی دعوتِ حق کے مستقل مراحل میں شمار کرتے ہیں اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یہ تمام امور ایک نہایت منظم جماعتی جدوجہد کے متقاضی ہیں' لیکن غامدی صاحب نہ صرف یہ کہ دعوتِ دین کے اس کام کے لئے تنظیم یا جماعت کو کوئی لازمی دینی ضرورت نہیں سمجھتے اور ان کے بقول یہ کام انفرادی طور پر بھی انجام دیئے جاسکتے ہیں (قانونِ دعوت' ص ۳۰) بلکہ ان کی دانست میں مرحلۂ ہجرت و براءت اور جنگ و قتال اب سرے سے دعوتِ حق کے مراحل میں شامل ہی نہیں ہیں!!! ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!! ——— (ادارہ)

محترم جاوید احمد غامدی صاحب
السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہونگے۔ آپ سے آپ کے مکان پر پچھلے سال جنوری میں ملاقات ہوئی تھی اور آپ کے دوستوں کی ہمراہی میں محترم مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے ملنے گیا تھا۔ میں آپ کے رسالہ "اشراق" کا مستقل خریدار ہوں اور اس بنا پر آپ کے افکار اور کاوشوں سے مستفیض ہوتا رہتا ہوں۔

اشراق ماہ اکتوبر ۱۹۹۲ء میرے سامنے ہے۔ اس رسالہ میں آپ کا مضمون "اسلامی انقلاب کا نبویؐ منہاج" "فکر و نظر" کے عنوان کے تحت پڑھا' لیکن اس سے طبیعت میں جو انقباضِ خاطر پیدا ہوا ہے اس کا تذکرہ نہ کرنا ایک دینی مداہنت ہوگی جس کا کم از کم میں متحمل نہیں ہو سکتا۔ اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃ

آپ نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب محترم کے فلسفۂ انقلابِ اسلامی اور اس کے ادوار پر جو طنز آمیز اور ہتک سے پُر تبصرہ فرمایا ہے وہ آپ جیسے اہلِ علم کے قطعی شایانِ شان نہیں ہے۔ اس سے علم کی تحقیر ہوئی ہے۔ یہ طنز و مزاح کا انداز علماءِ کرام کے رہے سہے وقار کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہے۔

آپ نے جو بزعم خود دعویٰ کیا ہے کہ انقلابِ اسلامی کے مراحل ـــــ دعوت، تنظیم، تربیت، خاموش مزاحمت، ہجرۃ اور قتال کا قرآن و حدیث میں کہیں ذکر نہیں ملتا، صحیح نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی ایک نمونہ ہے، اس کے اَن گنت گوشے ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے بے شمار approaches ہوسکتی ہیں۔ ان کا تجزیہ کیجئے اور آپؐ کے اقامتِ دین کی جدوجہد کے Process کو ایک ابھرتی ہوئی تحریک کے نمایاں ہوتے ہوئے خدوخال اور جاں گسل مزاحمت کو پیش نظر رکھئے تو یہ سارے مراحل خود بخود ایک ایک کرکے آپ کے سامنے آتے چلے جائیں گے۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ (خدا کرے میرا اندازہ غلط ہو) کہ آپ نہ کبھی کسی تحریک میں شامل ہوئے اور نہ عملاً کوئی اسلامی تحریک برپا کی۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ کو ان ادوار کا بدرجۂ اتم اندازہ ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ صرف ایک روایتی Academician (محققِ محض) بن کر رہ گئے ہیں اور شاید اسی لئے ع "تیرا ہیر دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے" کا عنوان بن کر محض علمی کاوشوں میں اپنی زندگی کے قیمتی لمحات گزار رہے ہیں۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی پوری کی پوری ہمارے لئے نمونہ اور دعوتِ مطالعہ ہے۔ ایک طرف آپ کے احکامات ہیں، دوسری طرف آپؐ کا عمل ہے، آپؐ کی زندگی کے تفصیلی محاکات ہیں۔ ہمارے سامنے آپؐ کی جاں گسل حیات مبارکہ ہے، جس سے گزر کر آپؐ نے اللہ کے دین کو عملاً برپا کیا، کفر و گمراہی کی طاقتوں کو مٹا کر اللہ کے دین کو پورے کا پورا قائم کیا۔ اس کے ان گنت گوشے ہیں جن پر محققین نے انمول کام کیا ہے اور قیامت تک کرتے رہیں گے۔ آپؐ کی حیات مبارکہ کا یہ بھی ایک اہم ترین پہلو ہے کہ جو تحریک آپؐ نے برپا کی وہ کن کن مراحل سے گزری۔ لیکن خدا بھلا کرے ہمارے بزرگان دین اور علماء کرام کا کہ انہوں نے زندگی کے جامد مسائل پر تو پوری صحاحِ ستہ جمع کردی، غسل، طہارت، وضو، نکاح، طلاق، صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ اور حج وغیرہ پر تو بڑی موشگافیاں کر ڈالیں، لیکن اقامتِ دین کی جدوجہد پر کوئی عنوان یا باب اپنے اپنے ضخیم مجموعات میں قائم نہ کرسکے۔ یہ امتِ مسلمہ کی بدقسمتی ہے کہ امت کا

پورا علمی سرمایہ اس سے خالی ہے[1] اور آپ علماء کرام انہی جامد مسائل کے بھنور میں پھنس کر ہمیشہ قَالَ اللّٰہُ وَ قَالَ الرَّسُوْل کا ورد کرتے رہتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ اللہ کا دین اس دنیا میں اب دوبارہ کیسے برپا کیا جائے' اس کے کیا مراحل ہیں اور ان کو عوام کے سامنے کس طرح آپ ایک سائنٹفک انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔

محض دعوت دعوت کی رٹ لگا کر دین قائم نہیں ہو جائیگا اور آپ نے شدت کے ساتھ اس کی آواز لگائی ہے۔ دعوت ایک ذریعہ ہے' mean ہے' end نہیں ہے۔ اور آپ نے دعوت کی رٹ اس لئے لگا رکھی ہے کہ دعوت الی اللہ کے پورے مراحل آپ کے سامنے نہیں ہیں' یا پھر آپ ان سے اغماض برت کر اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ علماء کرام کا عام طرز عمل ہے۔ ان کے نزدیک دعوت اول بھی ہے اور آخر بھی۔ وہ اس کی رٹ لگا کر اللہ کے دین کے آگے کے تقاضوں سے' جہاں دل و جان کے نقد نذرانے پیش کرنا پڑتے ہیں' اپنی جان بچا جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنی ذات اور اپنے ساتھیوں کو اس زمرہ میں شریک کرنا نہ پسند کریں گے۔ دعوت تو اس اقامتِ دین کی جدوجہد کی اول اور پہلی منزل ہے' اس کو آگے بڑھا کر آپ کو اسے اپنے فطری نتائج تک پہنچانا ہوگا۔ یہ کام فرشتے نہیں کریں گے۔ اس کو منزل تک پہنچانے کا کام انسانی ہاتھ ہی کریں گے اور ان کو اسی لئے اپنی منزل کے سارے سنگ ہائے میل اور مراحل سے واقف ہونا چاہئے' ورنہ جادۂ حق کا کارواں گم کردہ راہ پر اپنی پہلی سیڑھی پر کھڑا کھڑا دعوت دعوت پکارتا ہوا اس دنیا سے چلا جائیگا اور حق پھر کسی دوسرے راہرو کی تلاش میں سرگرداں ہو کر بادیہ پیمائی کریگا یا پھر منتظرِ فردا ہو کر قرآن کے اوراق اور رسول اللہؐ کی کھلی ہوئی سیرۃ طیبہ میں روپوش پڑا رہیگا کہ دیکھیں کہ اب کب کوئی سر پھرا اٹھتا ہے اور اپنے جان و دل کا نذرانہ لے کر آگے بڑھتا ہے تاکہ اللہ کا دین دوبارہ اس دنیا میں قائم ہو سکے۔

---

[1] ہماری رائے میں یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ اس وقت تک نہ صرف یہ کہ خلافت کے ادارے کی شکل میں عالم اسلام کی کم از کم ایک علامتی وحدت بھی برقرار تھی' بلکہ اسلامی قانون و شریعت کی علمداری بھی برقرار تھی' لہٰذا علماءِ دین کی اصل توجہ اسلامی قانون و فقہ کی جانب تھی ---(ادارہ)

تاریخ جدید میں یا ماضی قریب میں جن اصحابِ علم و حکمت نے داعی الی اللہ کا کردار ادا کیا ان میں مولانا مودودی مرحوم اور حسن البناء شہید کو ایک مقام خاص حاصل ہے۔ وہ تحریک اسلامی کے گلِ سرسبد ہیں۔ انہوں نے اسی انداز میں تحریک کو چلایا جس پر اللہ کے رسولؐ نے چلا کر دکھایا تھا۔ انہوں نے منزل کی طرف جانے والے سنگِ میل کا اپنے اپنے انداز میں تذکرہ کیا اور قافلہ بنا کر اس راہ پر چل پڑے، اور اب وہی دورِ حاضر کی اسلامی تحریکات کا سرمایۂ دل وجان ہے اور اسی پر دیگر ممالک میں اسلامی تحریکیں برپا ہو رہی ہیں۔

آپ کسی بھی تحریک کا بغور مطالعہ کریں (قطع نظر اس سے کہ وہ اسلامی ہو یا لادینی) اس کے لئے پہلے تین مراحل لازمی ہیں۔ دعوت تو پہلا مرحلہ ہے اور یہیں سے کام کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر جو لوگ اس دعوت پر لبیک کہتے ہیں ان کو ایک نظم میں پرونا اس کا دوسرا مرحلہ ہے۔ پھر تحریک کے مزاج کے مطابق ان افراد کی تربیت و تزکیہ کرنا اس کا تیسرا مرحلہ ہے۔ اور یہ تینوں مرحلے بیک وقت جاری اور ساری ہوتے ہیں۔ اس طرح لوگ تربیت پا کر اسی دعوت کے کام پر لگ جاتے ہیں۔ معاشرہ میں کہیں خلاء نہیں ہوتا، نہ رسول اللہؐ کے دور میں تھا اور نہ اب کہیں ہے۔ باطل کے گماشتے جن کے ہاتھوں میں اقتدار کی چابیاں ہوتی ہیں حق کی بڑھتی ہوئی افرادی طاقت سے خطرہ محسوس کرتے ہیں اور پھر ظلم اور زیادتیوں کے ہتھیار لے کر حق کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، جس سے حق کے علمبرداروں کے ایمان کا امتحان بھی ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے دل و دماغ اور سیرت و کردار کی خفیہ قوتیں و صلاحیتیں اجاگر ہو کر پختہ کار ہوجاتی ہیں جو تعمیرِ سیرت اور عظیم ذمہ داریوں کے سنبھالنے کے لئے ناگزیر ہیں۔ اس مرحلہ پر اگر حق ظلم کے خلاف retaliate کرے تو اپنے کاز (مقصد) کو نقصان پہنچائے گا، اپنی راہ کو کھوٹی کرلے گا اور شیطانی قوتیں یہی چاہتی ہیں کہ حق کے علمبرداروں کو تنگ کر کے اور اشتعال دلا کر ان کے کام میں رخنہ ڈال دیں۔ قرآن کریم اس stage پر صاف اور واضح طور پر warning دے رہا ہے۔ آپ سورۃ حم السجدہ میں آیات ۳۴ تا ۳۶ کا بغور مطالعہ اسی کشمکش کی روشنی میں کریں تو بات پوری طرح واضح ہو کر آپ کے سامنے آجائیگی۔ لیکن جب تک آپ عملاً کوئی تحریک برپا نہ کریں گے یا کسی اصلاحی تحریک کا حصہ نہ بنیں گے

یہ بات آپ کے سمجھنے میں نہیں آئیگی۔ آپ ان آیات کو اس کربناک ماحول میں رہ کر مطالعہ کریں جس سے رسول اللہؐ اور ان کے ساتھی دوچار تھے۔ یہ مرحلہ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی پر محیط ہے۔ اور یہی تحریک اسلامی کا Peaceful Resistance کا دور ہے۔

اس کے بعد تحریک آگے بڑھتی ہے، اس لئے کہ اب اس کو وہ افرادِ کار میسر آگئے جن کی سیرۃ و کردار پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ اب داعی اور اس کے ساتھیوں کو ہجرت کرنا پڑتی ہے۔ آپ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے شاگردِ رشید ہیں اور تدبرِ قرآن آپ کا اوڑھنا اور بچھونا ہے۔ آپ ذرا اس کو کھول کر دیکھیں کہ مولانا محترم نے کس شدومد سے ہجرۃ کی سنت کو جگہ جگہ اجاگر کیا ہے کہ یہ ہر نبی کو پیش آتی ہے اللہ کے حکم سے اور کیونکر پیش آتی ہے۔

اس کے بعد کا مرحلہ صرف قتال کا ہے جو تحریک اسلامی کی کامیابی کے لئے ایک لازمی شرط ہے۔ یہ بالکل آخری مرحلہ ہے باطل کی قوت اور مزاحمت کو توڑنے کے لئے۔ افغانستان کی تحریکِ اسلامی کو اس مرحلہ سے اب گزرنا ہے تاکہ شاید اللہ کا دین وہاں قائم ہو سکے، لیکن وہاں قافلہ حق کے لوگ ایک شش و پنج میں مبتلا ہیں یا پھر باطل کی قوتوں نے ان کو مبتلا کر رکھا ہے جس سے اگر وہ جلد نہ نکلے تو (خاکم بدہن) وہ اپنی جیتی ہوئی بازی ہار جائیں گے۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ یہ مرحلہ تحریک اسلامی پاکستان کو بھی پیش آئیگا، لیکن کب؟ اس کا جواب مستقبل ہی دیگا۔

یہ پورے چھ مراحل رسول اللہؐ کی زندگی سے عیاں ہیں۔ اگر کوئی ان سے انکار کرتا ہے تو اس کے لئے میرے پاس ایک ہی جواب ہے کہ **وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا** (فرقان ۶۳) ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے انداز میں انہی مراحل کا ذکر کیا ہے اور بڑے شد و مد سے کرتے رہتے ہیں اور اسی کو انہوں نے عملی منہاجِ نبوۃ کہا ہے تو آپ کیوں چراغ پا ہو رہے ہیں۔ ایک حق بات کو جہالت سے رد کرنا علماء کرام کا شیوہ نہیں ہے۔ آپ سے یہ توقع ہے کہ آپ اپنے قلم کو ان مراحل کے مزید خدوخال اجاگر کرنے میں صرف کریں گے نہ کہ ان کی بیخ کنی میں۔ **فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ**۔

یہاں امریکہ میں ہم بھی اپنی حقیری کوشش اقامتِ دین کے لئے کر رہے ہیں۔ اس کے لئے لٹریچر حالات کو سامنے رکھ کر تیار کر رہے ہیں۔ میری کتاب

"Methodology of Dawah Ilallah" آپ دیکھیں تو سارے مراحل آپ کی سمجھ میں آجائیں گے۔ اگر آپ کو کہیں اس میں فکری خامیاں نظر آئیں تو ضرور لکھیں میں آپ کا مشکور ہونگا۔ ویسے ضد اور ہٹ دھرمی کا علاج دنیا میں کسی کے پاس نہیں اور میں اللہ سے دعاگو ہوں کہ وہ آپ کو اور مجھ کو اس سے بہت دور رکھے' آمین۔

رہا ڈاکٹر صاحب کا اپنی ذاتی سمع و طاعت کی بیعت لینا تو یہ ان کا اپنا ذاتی مسئلہ ہے جس سے خود مجھ کو بھی اختلاف ہے۔ میری ان سے تفصیلی گفتگو اس مسئلہ پر ہو چکی ہے۔ یہ ذاتی بیعت کا موقف انہوں نے مولانا مرحوم کی ضد میں اختیار کیا ہے' لیکن اس کے لئے وہ حدیث اور امت کی روایت میں سے دلائل پیش کرتے ہیں۔ یہ ان کی راہ ہے' کوئی حرام شے تو نہیں ہے' جس کا دل قبول کرے وہ آگے بڑھ کر بیعت کرے اور جس کا دل قبول نہ کرے وہ اپنی راہ خود متعین کرکے اقامتِ دین کی جدوجہد میں لگ جائے۔ اس پر تبرہ پڑھنا' اس کی تضحیک کرنا کسی انداز میں بھی زیب نہیں دیتا۔ اگر بیعت کا طریقہ غلط ہے تو اس پر علمی انداز میں' جس کے آپ شہسوار ہیں' تبصرہ کیجئے۔ اس کی خامیاں واضح کر دیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ جب علمی انداز میں آپ اس کی گرفت کریں گے تو یقیناً ڈاکٹر صاحب اس سے رجوع کرلیں گے۔ وہ اپنی رائے پر اصرار نہ کریں گے۔

رہا مسئلہ تحریک اسلامی یا تنظیم اسلامی کی کامیابی یا ناکامیابی کا تو اس کی وجہ علماء کرام کی گل اندازی ہے جو خود تو آگے بڑھتے نہیں بلکہ پسِ دیوار رہ کر یا پھر "صحافت کے شیش محل" میں بیٹھ کر سنگ باری کرتے رہتے ہیں اور عوام میں ان تحریکوں کے امیج (Image) کو بگاڑتے یا گراتے رہتے ہیں اور عوام جو پہلے ہی دین سے بہت دور جا چکے ہیں وہ جب دیکھتے ہیں کہ اچھے خاصے علماء خود ہی آپس میں ایک دوسرے کی پگڑی اچھال رہے ہیں تو وہ وحشت زدہ ہو کر عافیت کوشی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

پاکستان میں اسلامی حکومت نہ بننے کا سارا وبال علماء کرام پر ہے۔ اگر وہ یک آواز ہو کر تحریک اسلامی کی معاونت کرتے تو باطل پرستوں کا اب تک خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ وہ پہلے تو مولانا مرحوم کی "قباء مطہرہ" کو تار تار کرنے کی کوشش کرتے رہے اور اب ڈاکٹر صاحب کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ یہ ایک شیطانی کھیل ہے جس کا کہیں تو شعوری طور پر اور کہیں غیر شعوری طور پر علماء کرام شکار ہو کر داعیانِ حق اور داعیان الی اللہ کے خلاف

ہرزہ سرائی کرتے رہتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی شدید باز پرس سے کیسے گزریں گے۔ واللعلم عند اللہ۔

امید ہے کہ آپ میری ان گزارشات کو اپنے کالموں میں جگہ دیں گے تاکہ بددلی کی فضا جو آپ کی نگارشات سے پھیلی ہے وہ دور ہو اور یوم حساب آپ سرخرو ہوں۔ فقط والسلام

احقر العباد
شمیم احمد صدیقی
نیویارک
۱۲ر اکتوبر ۹۲ء

بقیہ: الاخوان المسلمون

پھر جب کہ اخوان کی قیادت کے علم میں یہ بات آ چکی تھی کہ ناصر نے "آزاد افسروں کی تنظیم" کے نام سے فوج میں ایک ذاتی حلقہ منظم کر لیا ہے تو اخوان کی قیادت کو اسے فوری طور پر منصوبہ کے مرکزی کردار کی حیثیت سے ہٹا دینا چاہئے تھا۔ اس کے باوجود کہ فوج سے وابستہ اخوانی ناصر کو ایک اور حلقہ بنانے سے مسلسل روک رہے تھے، وہ ایسا کئے جا رہا تھا۔ پھر یہ اخوان قیادت کا اس پر اندھا اعتماد نہیں تو اور کیا تھا کہ وہی انقلاب کے پروگرام کو عملی جامہ بھی پہناتا رہا۔ ناصر کی نظم سے سرکشی سے صرف نظر کے علاوہ غداری کے امکان کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی متبادل منصوبہ بندی بھی نہ کی گئی، ورنہ اس بات کا پورا امکان تھا کہ حالات یہ رخ نہ دھارتے۔

تحریک الاخوان المسلمون

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۹ء تک (۴)

قاضی ظفر الحق

پھر سوئے منزل عشق چلا

قیادت کے باقاعدہ انتخاب کے بعد حسن الہضیبی کی مدبرانہ' ناصحانہ اور ٹھنڈے مزاج کی قیادت میں کاروانِ عشق ایک بار پھر سوئے منزل گامزن ہوا۔ اس دفعہ وسعت سے زیادہ استحکام اور کمیت سے زیادہ کیفیت پر توجہ تھی۔ مصر میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے یہ طے پایا کہ شاہ اور اس کے انگریز پرست ٹولے اور انگریزوں کے وجود سے مصر کو اولاً پاک کیا جائے اور پھر پوری قوت سے شریعت اسلامیہ کے نفاذ کا عمل شروع کر دیا جائے۔ اخوان نے پورے اخلاص اور بڑی محنت کے ساتھ اپنے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنایا اور جہاں تک اس منصوبہ کے پہلے جزو کا تعلق ہے وہ اس کو بروئے کار لانے میں کامیاب بھی ہو گئے' مگر برطانیہ اور اس کے گماشتوں کو میدان سے ہٹاتے ہوئے نفاذِ اسلام کے علمبردار ایک اور شاطر اور تازہ دم صلیبی قوت کی سازشوں کا شکار ہو گئے۔ یہ داستان بڑی روح فرسا اور خونچکاں ہے مگر ہماری مجبوری ہے کہ ہم اپنے قارئین کو اس سے آگاہ کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس باعث صد آزار سلسلۂ واقعات کا ایک پس منظر بھی ہے جسے سامنے رکھنا اسکا حقیقی رخ دیکھنے کے لئے ضروری ہے۔

۱۹۳۹ء میں جب دوسری عالمگیر جنگ چھڑی تو ساری دنیا برطانیہ اور فرانس کے شکنجہ میں جکڑی ہوئی تھی اور مختلف ابھرتی ہوئی طاقتیں ان دو بڑے عالمی مجرموں کے ساتھ منڈیوں کے حصول کی خاطر نبرد آزمائی کر رہی تھیں۔ ان میں اہم جرمنی' روس' جاپان اور امریکہ تھے۔ منڈیوں (یعنی کمزور ممالک) پر جو چھینا جھپٹی ہو رہی تھی اس کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ ہر طاقت کمزور اور بے بس ممالک پر زبردستی قبضہ کر لینا چاہتی تھی اور جہاں

ایسا ممکن نہ ہوتا وہاں سب نے یہ طریقۂ کار اختیار کر لیا تھا کہ ان ملکوں کے حکمران طبقات میں اپنے حامی وایجنٹ پیدا کرتے بلکہ قیمت لگا کر انہیں خریدتے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات تو بالکل ظاہر تھی کہ جہاں کسی کا گماشتہ حکمران ہوتا وہ طاقت اس کی حفاظت میں اور مخالف قوتوں کے حامیوں کے استیصال کی کوشش میں مصروف رہتی اور جہاں اس کا گماشتہ برسرِاقتدار نہ ہوتا وہاں دوسری طاقت کے حامی یا ایجنٹ کو ہٹانے اور اپنا آدمی برسرِاقتدار لانے کے لئے جوڑ توڑ جاری رہتا۔ اسی دوران میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی اور جرمنی و جاپان کو چاروں شانے چت اور فرانس اور برطانیہ کو بے حال کر کے ختم ہو گئی۔ اب میدان میں دو طاقتیں رہ گئی تھیں یعنی روس اور امریکہ۔ امریکہ اپنے سیاسی اور معاشی نظام اور نظریات کے اعتبار سے فرانس اور برطانیہ کا صحیح جانشین تھا' لہٰذا اس کو روس سے بازی جیتنے میں کچھ زیادہ دقت پیش نہ آئی اور فرانس اور برطانیہ سے وابستہ ٹولے خود بخود امریکہ کی گود میں گرنے لگے۔ امریکہ بھی اپنی پیش رو ان طاقتوں کے تعاقب میں رہا' تا آنکہ اس نے ان کے ہتھیائے ہوئے ممالک سیاسی و معاشی طور پر ان سے چھین لئے یا پھر یہ طاقتیں امریکہ کو اپنے ساتھ شریک کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

امریکہ کے پالیسی سازوں نے جنگ عظیم کے بعد ماضی اور حال کے تمام حالات و واقعات کا تجزیہ کر کے ایک نکتہ تو یہ اخذ کیا کہ اگر اس نے بھی برطانیہ اور فرانس کی طرح براہِ راست قبضہ کا طریقہ اختیار کیا تو اس کے لئے بھی آزادی کی نہ ختم ہونے والی تحریکوں کی مصیبت سے نمٹنا مشکل ہو گا' لہٰذا وقت کا تقاضا ہے کہ بالواسطہ حکومت کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اور دوسرا نکتہ انہوں نے یہ اخذ کیا کہ یورپی استعمار کے خلاف جدوجہد کے دوران میں کمزور ممالک کے عوام میں جو نفرت سامراج کے خلاف پیدا ہو گئی ہے وہ کسی بھی وقت ان ممالک کی حکومتوں کو اس بات پر مجبور کر سکتی ہے کہ وہ اپنے ممالک کے مفاد کے خلاف اور گوروں کے حق میں کوئی قدم نہ اٹھا پائیں۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان ممالک کو عوام کی جمہوری حکومتوں سے محروم رکھ کر ان پر ایسی آمریتیں مسلط کر دی جائیں جو عوام کے مینڈیٹ وغیرہ کی محتاج ہی نہ ہوں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ کسی ملک کی ساری پارٹیوں کو خریدنا اور ایسی جمہوری حکومتوں کو جو عوام کی طاقت اپنی پشت پر رکھتی ہوں اپنے سامنے جھکانا ممکن بھی نہیں ہے' لہٰذا جب تک امریکی فکر و مزاج

کے حامل سرمایہ دار اپنا حلقہ کسی ملک پر پھیلا کر اس کو اپنے جال میں خوب اچھی طرح کس نہ لیں اس ملک کے حق میں امریکی نقطۂ نگاہ سے آمریت ہی بہتر ہے۔ چنانچہ ان دو نکات پر امریکی منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنایا جانے لگا۔ اس منصوبے کا ایک بڑا حصہ شرقِ اوسط سے متعلق تھا جس کا آغاز سعودی عرب کے شاہی خاندان سے نیاز مندانہ مراسم اور مصر کی افواج میں اپنے حامی تلاش کرنے سے ہوا اور بالآخر آج امریکہ شرقِ اوسط کا بلا شرکت غیرے حکمران ہے۔ اس مقام تک پہنچنے کے لئے جہاں امریکی حکومت نے برطانوی اور فرانسیسی غلبہ کے خلاف جنگ جیتی ہے وہاں وہ مقامی طور پر اسلام کے نفاذ کی علمبردار تحریکوں کو کچلنے کا کام بھی کرتا اور کراتا رہا ہے۔ ہماری ممدوح اسلامی تحریک بھی اسی ناوک سے گھائل ہوئی ہے اور ہمارے سامنے اسی کی تفصیل بیان کرنا مقصود ہے۔

مصر کے تمام حلقوں کی مانند اخوان کی دعوت فوج میں بھی نفوذ کر رہی تھی۔ ۱۹۴۰ء کے قریب عرصہ میں الاخوان کے رسائل فوجی یونٹوں میں پہنچے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہوگئے' حالانکہ اس وقت فوج برطانیہ کے کنٹرول میں تھی۔ حسن البناء کو فوجی یونٹوں کے اندر منعقد ہونے والی دینی تقریبات میں مدعو کیا جانے لگا۔ فوج میں اخوان کے مرشد عام نے اپنی شخصیت' خوش کلامی اور بیدار مغزی سے بہت جلد محبوبیت کا مقام حاصل کرلیا' چنانچہ فوجی ان سے بیعت کرنے کی خواہش ظاہر کرنے لگے۔ اس معاملہ کی اہمیت اور نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے حسن البناء رحمہ اللہ نے فوجیوں سے رابطہ کرنے کے لئے میجر محمود لبیب کو اور بیعت لینے کے لئے صالح عشماوی کو مقرر کیا۔ میجر محمود نے انتہائی خوش اسلوبی سے اپنے فرض کو ادا کیا اور جلد ہی جنرل اور کرنل تک اس بیعت کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ مرحوم جنرل صلاح شادی اسی زمانے میں تحریک کے ساتھی بنے۔ جلد ہی میجر محمود اور فلائٹ لیفٹیننٹ عبدالمنعم عبدالرؤف کی کوششوں سے فوج میں اخوان کا پہلا باقاعدہ اسرہ کام کرنے لگا' جس کے ارکان میں جو افسر شامل تھے' ان میں جمال عبدالناصر' صلاح خلیفہ' حسین حمودہ' خالد محی الدین' سعد توفیق' کمال الدین حسین اور عبدالحکیم عامر وغیرہ شامل تھے۔ بعد میں اس اسرہ میں حسن ابراہیم' حسین شافعی' صلاح سالم' عبداللطیف بغدادی' فواد جاسر' جمال ربیع اور انور السادات وغیرہ بھی آگئے۔

جس زمانہ میں فلسطین برطانوی انتداب میں تھا اور اس کی زیرِ نگرانی یہودی جنگجو تنظیمیں شٹیرن' ہاجاناہ اور ارجون وغیرہ عام فلسطینی باشندوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہی تھیں' اس زمانہ میں اخوان نے طے کیا کہ اخوانی فدائین مسلح جہاد کے ذریعہ اس صیہونی اور صلیبی سازش کو ناکام بنائیں گے۔ شیخ محمد فرغلی ان دنوں فلسطین میں مجاہدین کی قیادت پر مامور کیے گئے تھے۔ انہوں نے اس بے جگری سے جہاد کی چکی چلائی کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے۔اس جذباتی موقع پر ہر مسلمان جہاد کا آرزو مند تھا اور اخوان نوجوان تو دیوانے ہوئے جارہے تھے۔ چنانچہ جمال عبدالناصر کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ نئے آنیوالے اخوانیوں کی فوجی تربیت کرے۔ اس زمانہ میں اس نے یہ کام بڑی تندہی سے انجام دیا۔

اسرائیلی ریاست کے قیام کا خواب پریشان ہونے کو تھا کہ نصرانی طاقتوں کے دباؤ میں آکر نقراشی پاشا نے جنگ بندی اور صلح کا اعلان کر دیا۔ مصر کے فوجیوں کو واپس بلا لیا گیا اور اخوانیوں کی راہ میں بڑے پہاڑ آسا روڑے اٹکائے جانے لگے۔ اس صورتحال نے اخوان سے وابستہ فوجیوں کو برانگیختہ کر دیا اور انہوں نے ارضِ فلسطین سے واپس ہونے سے پہلے انقلابِ حکومت کا عہد کیا۔ ابھی اس عہد سے مصر کے اخوان کو متفق کرنے کا کام ہو ہی رہا تھا کہ اخوان پر پابندی لگ گئی۔ دفاتر' مراکز اور کمپنیاں ضبط ہو گئیں اور صف دوم پابند سلاسل کر دی گئی۔ نقراشی پاشا کے قتل کے بعد ابراہیم عبدالہادی کے زمانہ میں سب سے پہلا کام حسن البناء کے قتل کا کیا گیا۔ اس طرح ایک عوامی انقلابی تحریک کا راستہ روک لیا گیا۔ عین ان دنوں جب انقلاب کا منصوبہ زیرِ غور تھا، تحریک کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائی اس کے سوا اور کس چیز کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ غداری ہوئی تھی۔ پھر جب ہم ۱۹۵۲ء کے انقلاب کے موقع پر ایک بار پھر غداری ہوتے دیکھتے ہیں تو ہمیں غداروں کے تعین میں زیادہ دشواری باقی نہیں رہتی۔

۱۹۵۰ء کے آخر میں جب مرشد عام کی بیعت کا مرحلہ طے ہوا تو انقلاب کا پروگرام از سرِ نو طے پایا۔ برطانیہ جنگ کے صدمے سے سنبھلتا جارہا تھا اور بظاہر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ مصر ایک بار پھر اس کی غیر معینہ غلامی میں جکڑا جانے والا ہے۔ مصر کے حالات دن بدن بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے۔ روز روز وزارتوں کی تبدیلی اور الٹے سیدھے معاہدوں نے اس کے قومی وجود کے لئے خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ عوام میں شاہ اور برطانیہ کے

خلاف مواد خوب اچھی طرح پک چکا تھا اور فضا انقلاب کے لئے بالکل سازگار تھی۔ اخوان نے حالات کا خوب اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد انقلاب کا منصوبہ طے کیا۔ ایڈووکیٹ حسن عشماوی، جنرل صلاح شادی اور کرنل جمال عبدالناصر کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ فوجی حلقوں میں رابطوں کو منظم کریں اور انتظامات مکمل ہونے پر مرکزی قیادت کو مطلع کریں۔ پروگرام یہ تھا کہ اخوان کے فوجی دستے حکومت کو برطرف کریں گے اور اخوان کے سول کارکن عوام کو جلسوں اور جلوسوں کے ذریعہ انقلاب کی تائید میں متحرک کریں گے اور عوامی سطح پر اس تبدیلی کے خیر مقدم کا بندوبست کریں گے۔ یہ طے تھا کہ فوجی الاخوان المسلمون کے نام سے یہ کارروائی کریں گے اور اخوانی قیادت کی طرف سے عطا کردہ ہدایات کے مطابق ہر شعبہ میں اصلاحات اور نفاذِ اسلام کا اعلان کریں گے۔ یہ بھی سوچ لیا گیا تھا کہ اگر سویز میں موجود غیر ملکی دستوں یا کسی اور طرف سے غیر ملکی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو کیا کرنا ہوگا۔ بظاہر منصوبہ ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ کرنل ناصر جو اس فوجی کارروائی کا نگران تھا ہر طرح کا اطمینان کر لینے کے بعد جنرل صلاح شادی کے پاس حاضر ہوا اور ان سے انقلاب کی اجازت مانگی۔ مرشد عام حسن الہضیبی اس وقت قاہرہ کے بجائے اسکندریہ میں تھے۔ جنرل صلاح شادی نے ناصر کو کچھ انتظار کرنے کا کہہ کر حسن عشماوی اور عبدالقادر حلمی کو اسکندریہ روانہ کیا۔ مرشد عام نے انہیں اجازت مرحمت فرماتے ہوئے کچھ ہدایات عطا فرمائیں، جن میں ان لوگوں سے از سرِ نو عہد کے تازہ کروالینے کا حکم بھی شامل تھا جو اس کارروائی میں شریک تھے۔ جنرل صلاح شادی نے ناصر کو بلا کر مرشد عام کے اذن سے آگاہ کیا اور اس نے اللہ کو گواہ ٹھہرا کر یہ عہد کیا کہ اس ساری تگ و تاز کا مقصد وحید اللہ کے دین کی سربلندی اور شریعت حقہ کا قیام و نفاذ ہوگا۔

۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کا دن انقلاب کے لئے طے ہوا اور سب کام طے شدہ منصوبہ کے مطابق انجام پا گیا۔ جمال عبدالناصر نے حسن عشماوی کو مبارکباد دی اور ان کے ذریعہ اپنے اہلِ خانہ کو آگاہ کروایا۔ شاہ فاروق کے بارے میں یہ طے ہونا باقی تھا کہ اس کا کیا کیا جائے۔ مرشد عام نے فرمایا کہ اسے جلا وطن کر دیا جائے، کیونکہ یہ جب تک مصر میں رہے گا سازشیں پروان چڑھتی رہیں گی۔ چنانچہ ایک بحری جہاز میں بٹھا کر اسے مصر سے

رخصت لر دیا کیا۔ اس نے رخصت کرنے والے فوجیوں سے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ تم بے قصور ہو' اصل شرارت کی جڑ اخوان ہیں۔

فوجیوں نے جنرل نجیب کو ملک کا سربراہ مقرر کیا اور ملک کا نظم و نسق چلانے کے لئے ایک فوجی کونسل کا اعلان کردیا' جبکہ طے یہ تھا کہ انقلاب اخوان کے نام سے برپا کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ نفاذِ اسلام کا ذکر تک نہ کیا گیا۔ جب مرشدِ عام نے ناصر سے مطالبہ کیا کہ ایفائے عہد کا تقاضا ہے کہ ہم اسلام کے ساتھ اپنی وابستگی کا واشگاف الفاظ میں اعلان کریں تو جمال عبدالناصر نے صاف انکار کردیا اور مزید یہ بھی کہا کہ ہم کسی کے اشاروں پر حرکت نہیں کریں گے۔ اسکا اشارہ مرشد عام کی طرف ہی تھا جن کے دستِ مبارک پر اس نے غلبۂ اسلام کی بیعت کی تھی۔

مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی

جمال عبدالناصر کے اپنے ساتھیوں سمیت بغاوت کر دینے سے مصر میں اسلامی انقلاب کا منصوبہ کئی دہائیاں پیچھے چلا گیا۔ وہ انقلاب جو سن پچاس کی دہائی کے بالکل آغاز میں برپا ہونے والا تھا اب اگر صدی کی آخری دہائی میں بھی صادر ہو جائے تو مصر کے حالات کے پیشِ نظر ایک معجزہ سے کم نہ ہوگا۔ "میثاق" کے قارئین کے ذہنوں میں بھی یہ سوال گردش کر رہا ہوگا کہ ایسا کیوں ہوا؟ تقدیرِ الٰہی سے تو انکار ممکن نہیں ہے مگر تقدیر' انسانی تدابیر کے جن پردوں میں کارفرما ہوتی ہے' فیصلہ تو ان پر کیا جاتا ہے۔ جمال عبدالناصر کے لچھن انقلاب سے پہلے ہی قابل توجہ تھے۔ وہ یہ دلیلیں دیا کرتا کہ اخوان کا نام انقلاب کے لئے استعمال نہ کیا جائے' اسلام کے بجائے اصلاحات کا پروگرام سامنے لایا جائے تاکہ مشکلات کم سے کم پیدا ہوں۔ اخوان کی قیادت اس کی دلیلوں کو اس کے اخلاص پر محمول کرتی اور یہ سمجھتی رہی کہ وہ واقعی اخوان اور انقلاب کو آزمائشوں سے بچانا چاہتا ہے' حالانکہ اس کی نیت تو یہ تھی کہ انقلاب کا قائد وہ خود کہلائے اور اخوان کا کردار صرف تائیدی سمجھا جانے لگے' نیز اسلام کے نام سے انقلاب برپا کرنے کا تو لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ دوست اور دشمن سب یہ جاننے لگیں کہ انکے عزائم کیا ہیں' جبکہ اصلاحات کی مبہم اصطلاح کے پردہ میں کیا ہوگا' اس کی کسی کو کیا خبر۔

(باقی صفحہ ۷۰ پر)

بقیہ: عرضِ احوال

ہیں اور ضرورت پڑنے پر وضاحت طلب امور کی توضیح فرماتے ہیں ـــــ ۲۷ تا ۳۱ر دسمبر' مسلسل پانچ روز تربیتی پروگراموں کے لئے مخصوص تھے۔ اس تربیت گاہ کی تفصیلی رپورٹ اگر اللہ نے چاہا تو آئندہ شمارے میں شامل ہوگی' اجمالاً عرض ہے کہ اس تربیتی پروگرام میں خاص طور پر امیر تنظیم اسلامی کے ان حالیہ مضامین کا اجتماعی مطالعہ ہوا جو "نوائے وقت" میں ہفتہ واری کالم کی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔ نظریاتی اور فکری اعتبار سے ان مضامین کی جو اہمیت ہے وہ محتاجِ بیان نہیں' چنانچہ اجتماعی مطالعے کے بعد ان مضامین پر اجتماعی مذاکرہ اور Discussion کا پروگرام بھی شاملِ تربیت گاہ تھا۔ محترم سراج الحق سید صاحب نے جماعتی اور انتظامی امور سے متعلق بعض اہم عنوانات پر نہایت مفید لیکچر دیئے۔ مزید برآں بعض دیگر سینئر رفقاء کے لیکچرز بھی پروگرام میں شامل تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں محترم عبدالرزاق صاحب نے "دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار" کے موضوع پر گفتگو کی' مختار حسین فاروقی صاحب نے اپنے خطاب میں انقلابی تربیت اور خانقاہی تربیت کے فرق پر روشنی ڈالی اور جناب رحمت اللہ بٹر صاحب نے بعض اہم عملی مسائل کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا۔ یہ پروگرام بحمداللہ بہت بھرپور اور کامیاب رہا اور اس کی افادیت کو تمام شرکاء نے نمایاں طور پر محسوس کیا۔ اللہ تعالیٰ اسے دین و دنیا کے لئے موجبِ سعادت بنائے' آمین۔

☆ ☆ ☆

"میثاق" کے پچھلے شمارے میں امیر تنظیم اسلامی' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ان رفقاء و احباب کا شکریہ ادا کیا تھا جو ان کی والدہ ماجدہ کی وفات پر تعزیت کے لئے خود تشریف لائے یا جنہوں نے خطوط کے ذریعے اظہارِ تعزیت کیا تھا۔ ماہ دسمبر کے دوران ہمیں بعض مزید احباب کی جانب سے تعزیتی خطوط موصول ہوئے ہیں جنہیں وفات کی اطلاع ہی دسمبر کے "میثاق" سے ہوئی تھی۔ علامہ شبیر بخاری صاحب نے اپنے تعزیتی پیغام کے ساتھ "ماں" کے عنوان سے ایک خوبصورت نظم بھی ارسال کی ہے جسے اسی شمارے کے ٹائیٹل کے اندرونی صفحے پر جگہ دی گئی ہے۔ دیگر احباب کے نام درج ذیل ہیں:-

امیر اقتدار گل خان نیازی صاحب، میانوالی
مولانا الطاف الرحمٰن بنوی صاحب، چکوال
حق نواز صاحب، اسکردو بلتستان
طاہر نسیم قریشی صاحب، پیرس
ڈاکٹر عبدالوہاب صاحب، کراچی
عبدالرؤف شاہ صاحب، الریاض، سعودیہ
مولانا غلام محمد صاحب، دارالعلوم، کراچی
غلام مصطفیٰ صاحب، الواسع، سعودیہ
غلام دستگیر صاحب، بحرین
غلام حسن صاحب، قصور
محمد اشرف صاحب، و رفقاء تنظیم، پیرس

راجہ محمد داؤد خان، رنگلہ، آزاد کشمیر
محمد خالد صاحب، دوبئی
محمد خیر محمد حجازی صاحب، المدرس بالمسجد الحرام
مولا بخش محمدی صاحب، دایا نوکوٹ، تھرپارکر (سندھ)
ڈاکٹر محمد اطہر قریشی، قیم جماعت اسلامی، صوبہ سندھ
مولانا محمد ازہر صاحب، خیر المدارس، ملتان
ڈاکٹر سید وحید احمد نقوی صاحب، حیدر آباد

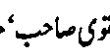

نرخنامہ اشتہارات

یکم جنوری ۹۳ء سے ماہنامہ میثاق میں شائع ہونے والے کاروباری اشتہارات کا نرخنامہ حسب ذیل ہوگا:

☆ سرورق کا پچھلا صفحہ (Back Title)	تین ہزار روپے فی اشاعت
☆ سرورق اندرونی صفحہ ۲	پچیس سو روپے فی اشاعت
☆ سرورق پچھلا اندرونی صفحہ ۳	دو ہزار روپے فی اشاعت
☆ عام اندرونی پورا صفحہ	پندرہ سو روپے فی اشاعت
☆ عام اندرونی نصف صفحہ	آٹھ سو روپے فی اشاعت

المعلن، مینجر "میثاق" ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور

بقیہ: الھدیٰ

ہوگا' یہاں سے نکلنا ہوگا' اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی تعلق منقطع ہو کر رہے گا۔ اہل وعیال سے بھی جدا ہونا پڑے گا۔ اس وقت انسان حسرت سے کہے گا: "رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ" کہ اے رب کیوں نہ تو نے مجھے ذرا اور مہلت دے دی' تو اگر ذرا اس وقت کو ٹال دے تو: "فَاَصَّدَّقَ" پھر میں یہ سب کچھ تیری راہ میں دے دوں' سارا مال صدقہ کردوں' "وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ○" اور میں بالکل سچائی اور صداقت کی راہ اختیار کرلوں' کاش مجھے تھوڑی سی مہلت اور مل جاتی تو میں صالحین میں سے ہوجاتا!! اس وقت بس یہی ایک حسرت ہوگی لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اللہ کی یہ سنت ثابتہ ہے کہ جب کسی کا وقت معین آجائے تو پھر اسے موخر نہیں کیا جاتا۔ "وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا" امتحان کا وقت ختم ہوچکا' اب تو نتیجے کے نکلنے کا انتظار کرو!! ـــــ اور آخری تنبیہہ کردی گئی کہ "وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ○" اللہ جانتا ہے جو کچھ کہ تم کرتے ہو۔ اس وقت کی یہ جزع فزع اور نالہ وشیون بھی فی الحقیقت منافقانہ ہوگی۔ اگر کہیں بالفرض کوئی مہلت مل بھی جائے تو پھر دوبارہ مال کی محبت عود کر آئے گی۔ اور پھر تم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے کنی کتراؤ گے۔ منافقت سے متعلق بنیادی اور تمہیدی مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے ہم نے سورۃ التوبہ کی وہ آیت پڑھی تھی جس میں واضح نقشہ کھینچا گیا ہے کہ کچھ لوگ ہیں کہ جو یہ دعا کرتے رہے کہ اللہ اگر ہمیں کشادگی اور غنی عطا فرمائے اور مال و دولت سے نوازے تو ہم اس کی راہ میں صدقہ و خیرات کریں گے' لیکن جب اللہ نے انہیں وہ سب کچھ دیا جو انہوں نے مانگا تھا تو اب وہ اس میں بخل سے کام لے رہے ہیں اور اللہ کی راہ میں صدقہ و خیرات پر آمادہ نہیں ہیں۔ فرمایا: "فَاَعْقَبَھُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِھِمْ" تو اس بدعہدی کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نفاق پیدا کردیا۔ تو اللہ ان منافقین کے ظاہر اور باطن دونوں سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر کہیں بالفرض انہیں مہلت مل جائے تو پھر بھی یہ وہی کچھ کریں گے۔ جیسے کہ سورۃ الانعام میں فرمایا: "وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُھُوْا عَنْہُ وَاِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ" کہ اگر ان کو لوٹا دیا جائے' ایک موقع اور دے دیا جائے تب بھی یہ ان حرکتوں کا اعادہ کریں گے جن سے انہیں روکا جاتا رہا ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○

بقیہ: فکر اقبال کی تعمیل . . . .

اور تجدید و احیائے دین کی "اولمپک ٹارچ" کو کچھ نہ کچھ آگے ضرور بڑھایا۔ اور اب ضرورت اس امر کی ہے کہ فکر کی صحت کو برقرار رکھتے ہوئے عملی کوتاہیوں اور تقصیروں کی تلافی کی فکر کی جائے۔ اور ع "چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی!" اور ۔" اک فصل پکی تو بھرپایا تب تک تو یہی کچھ کرنا ہے!" اور "دما دم زن" کے انداز میں جدوجہد رکھی جائے!

KHALID TRADERS
IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE
AUTHORIZED AGENTS NTN BEARINGS

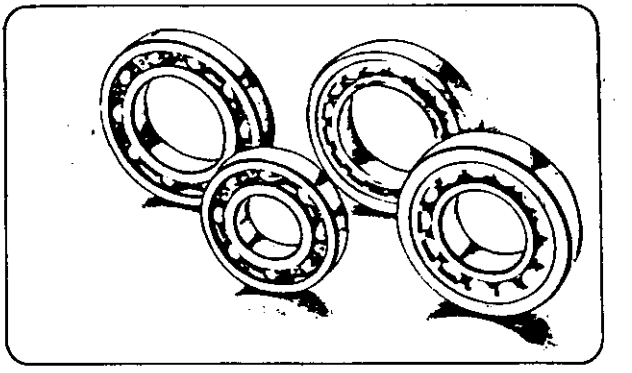

PLEASE CONTACT
TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734778

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65, Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169

GUJRANWALA : 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

ہم مغرب سے مقابلہ کرتے ہیں

....اور اُن ہی کی سرزمین پر!

ہم اپنے گارمنٹس، بیڈلنن اور ٹیکسٹائل کی دیگر مصنوعات مغربی ممالک، اسکینڈی نیوین ممالک، شمالی امریکہ، روس اور مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں کو برآمد کرتے ہیں اور ہماری برآمدات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے لیکن بیرونی منڈیوں میں اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لئے ہمیں انتھک محنت کرکے اپنی فنی مہارت اور معلومات میں مستقل اضافہ کرتے رہنا پڑتا ہے۔ ایسی محنت جو ہمیں تُرک کر دم نہیں لینے دیتی، ایسی محنت جو ہماری کارکردگی کے معیار کو اور بلند کرتی ہے، ایسی محنت جو کوالٹی، ڈیزائن اور پابندیٔ وقت کے سلسلے میں کرم فرماؤں کے مطالبات اطمینان بخش طریقے پر پورا کرنے کا ہمیں اہل بناتی ہے۔

Made in Pakistan
Registered Trade Mark

Jawad®

جہاں شرط مہارت
وہاں جیت ہماری

معیاری گارمنٹس تیار کرنے اور برآمد کرنے والے

ایسوسی ایٹڈ انڈسٹریز (گارمنٹس) پاکستان (پرائیویٹ) لمیٹڈ

IV/C/3-A ناظم آباد، کراچی - 18 - پاکستان - فون 610220-616018-628209
کیبل "JAWADSONS" ٹیلیکس 24555 JAWAD PK فیکس 610522 (92-21)

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

REGD NO.L 7360
VOL.42 NO.1
JAN. 1993

سُرفی کول

کف سیرپ اور ٹیبلٹس

کھانسی اور گلے کی
خراش کا زود اثر علاج

سرفی کول کف سیرپ قدرتی جڑی بوٹیوں کے اجزائے موثرہ کی وجہ سے ہر قسم کی کھانسی میں فوری اثر کرتا ہے۔ **سرفی کول** چوسنے والی خوشبو دار ٹیبلٹس گلے کی خراش اور کھانسی میں آرام پہنچاتی ہیں۔ بار بار اٹھنے والی کھانسی میں بھی مفید ہیں بہتر نتائج کے لیے **سرفی کول** کف سیرپ کے ساتھ **سرفی کول** ٹیبلٹس کا استعمال کریں۔
خاندان کے ہر فرد کے لیے مفید **سرفی کول** جس کا باقاعدہ استعمال موسمی اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔

تحقیق کی روایت ۔ معیار کی ضمانت